بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورۃ الفاتحہ

کی حکیمانہ انقلابی تفسیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

یوں تو اس سورت کے بہت سے نام حدیثوں میں آئے ہیں، لیکن چند ایک بہت مشہور ہیں، مثلاً الفاتحہ، دیباچہ قرآن، اُمُّ الْکِتَاب (بنیادی تعلیم)، الاساس 'تعلیمات قرآنیہ کی بنیاد' سُورۃُ الدّعاء - قرآن حکیم میں اسے سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ (۸۷: ۱۵) (سات آیات جو بار بار دہرائی جاتی ہیں)، کا نام دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول:

حضرت نبی اکرم ﷺ پر غار حرا میں سب سے پہلے یہ آیتیں نازل ہوئیں:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ اِقْرَاْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ ۙ﴿۳﴾ (۹۶: ۱-۳)

(اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھئے، جس نے پیدا کیا انسان کو، خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھئے اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے۔)

ان آیات کے نازل ہونے کے چند روز بعد ہی پوری سورہ فاتحہ مع بسم اللہ نازل ہوئی، اور یہ نماز کا ایسا لازم جزو قرار دی گئی کہ بلاواسطہ یا بالواسطہ پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

مضمون:

یہ سورت قرآن حکیم کی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔

بات یہ ہے کہ انسان اجتماع (Society) میں رہ کر ہی ترقی کر سکتا ہے، خود اس کی فطرت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ چھوٹے چھوٹے اجتماع مل کر ایک انسانی برادری بن جائے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ترقی کن برادری ایک ہی فکر رکھنے والے لوگوں کی ہوسکتی ہے۔ جو لوگ اس فطری اصول کے خلاف چلیں وہ نہ صرف اس دنیا میں ناکام رہتے ہیں بلکہ اس ناکامی کی وجہ سے مرنے کے بعد کی زندگی (آخرت) میں بھی نامراد رہیں گے۔

قرآن حکیم انسان کی بلند ترین اجتماعی زندگی (Social Life) کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اس لئے سورۂ فاتحہ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسانی فطرت کو سمجھنے والے اور اس کے مطابق کام کرنے والے لوگوں کو جمع کیا جائے، ایسی جماعت انسانی اجتماع کے مرکز میں رہے گی اور اس اجتماع کی رہنمائی کرے گی۔

انسانی فطرت کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اس فطرت کے سمجھنے کے لئے علم اور اس کے مطابق کام کرنے کی توفیق اسی سے حاصل ہو سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس سورت کو دعاء کی شکل دی گئی ہے۔ جس میں انسانی ارادے اور ہمت کو بھی کچھ دخل حاصل ہے۔ یہ دعا بھی اجتماعی رنگ میں ہے۔

ربط

نبی اکرم ﷺ کی نبوت کے دو درجے :

(۱) **قومی درجہ**: جیسے اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے، سب سے پہلے "سورۃ العلق" یا "اقرأ" نازل ہوئی۔ (مکتوبی شکل میں یہ سورۃ ۹۶ نمبر پر تیسویں پارے میں ہے) اس میں نبی اکرم ﷺ کی نبوت کے پہلے درجے کا ذکر ہے۔ اسی درجے میں آپ ﷺ کا مقصد قریش اور ان کے ارد گرد بسنے والے عرب قبیلوں کی اصلاح تھا۔[1] یہ گویا آپ ﷺ کی نبوت کا قومی درجہ تھا۔

انسان اپنی قوم کو اپنے طبعی رشتوں یعنی ماں باپ کے ذریعے سے پھیلنے والے سلسلوں سے پہچانتا ہے۔ اگر وہ اپنے حسب و نسب کی کڑیوں کا دور تک تتبع کرے، تو وہ دیکھے گا کہ اس کے خاندان کے افراد ہی کے پھیلنے سے اس کی قوم کا اکثر حصہ بنا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے پہلی سورت 'العلق' کا آغاز "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳" (۹۶-۱-۳)[2] سے کیا ہے، جس میں اس نے اپنے آپ کو انسان کے

---

[1] امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں : (ا) اس امام کے لئے جو مختلف قوموں کو ایک فکر پر جمع کرے، چند اصول کار ضروری ہوں گے۔ ان اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ پہلے ایک قوم کو راہ راست کی طرف بلائے گا، اور اسی کے اخلاق کو ٹھیک کر کے ان کی حالت کی اصلاح کرے گا، پھر اسے اپنی تحریک کی اشاعت کے لئے آلہ کار بنائے گا، اور اس کی مدد سے دنیا کی دوسری قوموں سے جہاد کرے گا، وہ اپنے (قومی) ساتھیوں کو دنیا کی مختلف قوموں میں بکھیر دے گا، چنانچہ (سورۃ آل عمران کی اس آیت "كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" (تم امت کا بہترین حصہ ہو، جو تمام انسانوں کے لئے مبعوث ہوئے ہو) کے یہی معنی ہیں۔" (حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱ ص ۱۱۸)

مہاجرین اور انصار کی ابتدائی جماعت، قریش اور ان کے ارد گرد کے قبیلوں کی اسلام لانے کا باعث بنی۔ پھر قریش اور یہ لوگ عراق اور شام کی فتح کا ذریعہ بنے اور قریش اور عراق و شام کے لوگ فارس اور روم کی فتح کا وسیلہ بنے، اور ان کے ذریعے سے ہند، ترکستان اور سوڈان کے علاقے فتح ہوئے۔" (حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، ص ۱۷۲) (مرتب)

[2] پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو خون کے لوتھڑے سے، پڑھئے (اور جان لیجئے کہ) آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے۔ (مرتب)

خالق اور پروردگار کی حیثیت سے متعارف کروایا ہے۔

(۲) **بین الاقوامی درجہ**: آپ کی نبوت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ آپ "مِلّتِ حَنِیْفِیَة ابراهِیْمِیَّه" پر تمام اقوام عالم کو جمع کریں گے۔ کیونکہ انسان کی نوعی ترقی کا یہی راستہ ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس دعاء "الفاتحہ" میں اپنے آپ کو "رَبُّ الْعَالَمِیْنَ" کی حیثیت سے شناخت کروایا ہے۔ اس تمہیدی دعا کے بعد سورۂ بقرہ وغیرہ۔ باقی قرآن حکیم میں تمام اقوام عالم کے لئے بنیادی دستور حیات دیا گیا ہے، جس پر انہیں جمع کیا جائے گا۔

یہ سورت قرآن حکیم کا مقدمہ ہے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ کی دعوت کی عالمی حیثیت کی طرف اشارہ ظاہر کرتا ہے، کہ آپ ﷺ کی نبوت کا یہ درجہ ہی آپ ﷺ کی بعثت کا اصل مقصد ہے۔ اور 'سورۃ العلق' کو قرآن حکیم کے آخر میں لے جانا ظاہر کرتا ہے، کہ قومی درجہ جس کی طرف سورۃ العلق میں اشارہ ہے، بین الاقوامی عالمی درجے کے لئے بطور تمہید اور وسیلے کے تھا۔ اس لئے انسانیت کے اندر عالمی تحریک ہی قرآن حکیم کی دعوت کا عنوان بن سکتی ہے۔

امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ :

اَلْاَنْبِیَآءُ قَبْلَ النَّبِیِّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانُوْا یُبْعَثُوْنَ اِلٰی اَقْوَامِهِمْ خَاصَّةً.... وَبُعِثَ نَبِیُّنَا صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِلٰی کَافَّةِ النَّاسِ (حجة الله البالغه، ج۱، ص: ۱۲۴)

(یعنی نبی اکرم ﷺ سے پہلے جو انبیاء گذرے ہیں وہ سب کے سب اپنی اپنی خاص قوم کی طرف بھیجے گئے تھے۔ لیکن حضرت محمد رسول اللہ ﷺ دنیا کی تمام اقوام کی طرف مبعوث ہوئے ہیں۔)

نیز فرماتے ہیں کہ :

"وَلَمَّا کَانَ الشَّرُّ السَّارِیْ فِیْ زَمَنِ اِبْرَاهِیْمَ عَلَیْهِ السَّلَامُ هُوَ نِسْیَانُ التَّوْحِیْدِ نَزَلَ الْحَقُّ بِاِزَآئِه بِاِشَاعَةِ التَّوْحِیْدِ وَتَوْلِیْدِ الْعِبَادَاتِ مِنْ طَهَارَةٍ وَصَلٰوةٍ وَزَکٰوةٍ وَحَجٍّ وَّصَوْمٍ وَذِکْرٍ وَلَمَّا کَانَ الشَّرُّ السَّارِیْ فِیْ زَمَنِ نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هو اخْتِلَالُ الْمِلَلِ وَانْقِلَابُ الْاِرْتِفَاقَاتِ خَاصَّةً عَلٰی اَصْحَابِهَا وَکَانَ الْاَمْرُ اَشَدَّ وَاَقْسٰی نَزَلَ الْحَقُّ بِاِزَآئِه بِالْجِهَادِ وَاِشَاعَةِ الْعِبَادَاتِ وَتَوْقِیْتِهَا وَالْقَضَآءِ بِزَوَالِ دَوْلَةِ الرُّوْمِ وَالْعَجَمِ وَانْتِظَامِ اَمْرِ النُّبُوَّةِ کَهَیْئَةِ الْاِرْتِفَاقِ الرَّابِعِ [1] (التفهيمات الاهية، جلد اول ص: ۸۲-۸۳)

(سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں نسیان توحید کا شر، معاشرۂ انسانی میں پھیل چکا تھا، اس لئے حق اس کے بالمقابل نازل ہوا، یعنی اشاعت توحید اور طہارت، صلوٰۃ، زکوۃ، روزوں اور ذکر الٰہی کی عبادات جاری کرنے کی شکل

[1] فَفَتَحَ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَابًا مِنَ الْخَیْرِ لَمْ یُفْتَحْ قَبْلَهٗ وَانْتَظَمَتْ بِه اُمَّةٌ مِنَ النَّاسِ هِیَ خَیْرُ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (تفهيمات ۸۳-۸۲)

میں۔ لیکن چونکہ ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اقوام عالم کی ثقافتوں میں خلل پڑ چکا تھا، اور انکی ارتفاقی زندگی میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا، اور یہ حالت نہایت شدید صورت اختیار کر گئی تھی اور یہ خرابیاں اقوام دنیا کے بدن میں دور تک سرایت کر گئی تھیں، اس لئے اب حق ان ضرورتوں کے لئے نازل ہوا اور قرار پایا کہ ان خرابیوں کے خلاف جہاد کیا جائے، اور عبادات کی اشاعت کی جائے، ان کے ادا کرنے کے اوقات معین کر دیئے جائیں اور قضا و قدر نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ رومی اور ایرانی سلطنتیں برباد کر کے ان کی جگہ نبوی نظام بین الاقوامی پیمانے پر قائم کیا جائے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے تشریف لا کر انسانی فلاح و خیر کا دروازہ کھولا، جو اس وقت تک نہ کھلا تھا اور اس خیر و فلاح انسانی کی تعلیم کے ذریعے سے انسانوں میں سے ایک ایسی امت (جماعت) منظّم کی جو نوع انسانی کے لئے بہترین (نمونے کی) جماعت بن گئی۔

حنیفیّت عالمی تحریک ہے:

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تحریک عالمی تحریک ہے، صرف عربی تحریک نہیں ہے۔ عربی تحریک اس عالمگیر تحریک کی ترقی کا ایک زینہ تھی، اور اس کے ارتقاء کی ایک منزل۔ یہ عالمی تحریک اصل میں حنیفی تحریک ہی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ نوع انسانی کو اس کی فطرت کے مطابق کمال تک پہنچایا جائے۔

دینی اور سیاسی تحریک میں فرق:

حنیفی تحریک میں ذہنی، عقلی، معاشی اور معاشرتی سب پہلو موجود ہیں، اور ان سب پہلوؤں میں ترقی ہی اسے تکمیل تک پہنچا سکتی ہے۔ ان پہلوؤں کے لحاظ سے یہ تحریک دینی بھی ہے اور سیاسی بھی، لیکن آج کل بعض لوگ دینی حرکت اور سیاسی حرکت میں فرق کرتے ہیں۔ یہ لوگ دینی حرکت کو خیالی (Idealogical) تحریک کہتے ہیں، اور اس لحاظ سے یہ صرف رہبانیت کی تحریک بن کر رہ جاتی ہے۔

سیاسی تحریک کو حقیقت پسندانہ (Realistic) تحریک قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک حنیفی تحریک کے بارے میں "دینی" اور "سیاسی" کی یہ تقسیم صحیح نہیں ہے، اور نہ یہ تقسیم کسی مضبوط بنیاد پر قائم ہے۔

اصل میں انسانیت شروع سے آخر تک ایک وجدانی (Unitary) چیز ہے، اسے تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اجتماعیت انسانی، کسی تحریک کو عمل کی سہولت کی غرض سے دینی اور سیاسی اجزاء میں تقسیم بھی کر لے، تو اس سے دو تحریکیں نہیں بن جاتیں، کیونکہ ان دونوں کا مقصد بہر کیف انسانیت عامہ کی ترقی ہی رہتا ہے۔ جب اہل دین ایسے

خیالات اور اعمال کی طرف رجعت اختیار کرلیں جو غیر محققانہ (Unscientific) ہوں، یا اہل سیاست انسانیت کے صرف معاشی پہلو کو لے کر بیٹھ جائیں، اور انسان کی مکمل انسانیت کی ترقی کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں تو یہ اختلاف صرف اصطلاحی اختلاف رہ جاتا ہے۔ ہم ان دونوں کی طرف التفات نہیں کرتے۔ اس کی مثال یوں سمجھنی چاہئے کہ ایک بادشاہ ممالک فتح کرنے کے درپے ہو جاتا ہے، تاکہ ان میں ظلم دور کرکے انصاف و عدل قائم کرے، ایک اور شخص سوسائٹی میں صحیح علم پھیلانے میں لگ جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں انسانیت کی تکمیل کر رہے ہیں۔ ان میں آپس میں کوئی تعارض نہیں ہے، اصل میں صحیح دین وہ ہے جس کے امام سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ وہی کامل اور مکمل انسانیت سے بحث کرتے ہیں اور ان کی تحریک عالمی تحریک ہے جو ایک ہی وقت میں دینی بھی ہے اور سیاسی اور معاشی بھی۔ اس تحریک کو بین الاقوامی پیمانے پر ترقی دینے کے لئے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے ہیں۔

دین کو سیاست کی ضرورت :

ایک علمی شخص اپنے علم کو انسانیت عامہ کے لئے مفید دیکھتا ہے۔ وہ یہ علم ان لوگوں کو سکھاتا ہے، جو اسے سیکھتے ہیں۔ اس فکر پر ان کے جمع ہو جانے سے طبعی طور پر جماعت (Party) بن جاتی ہے، جو اس اجتماع سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ اگر وہ شخص چاہے کہ اس کے عمل کو دوسرے لوگ جو اس کے طریقے سے واقف نہیں ہیں، یا جو اس فکر کی ترقی میں اپنے ذاتی مفادات (Vested Interests) کا نقصان تصور کرتے ہیں قوت کے ذریعے سے خراب کردیں تو کیا صحیح علم کے مالک کے لئے یہ ضروری نہ ہوگا کہ اپنے فکر کی حفاظت کے لئے قوت دفاع (Power of Defense) مہیا کرے؟ اور کیا اس طرح اسے سیاست کے میدان میں آنا نہیں پڑے گا؟ اس سے ظاہر ہے کہ صحیح علم کے لئے سیاست (Politics) اور حکومت (State) ضروری اور ناگزیر ہیں۔ اس لئے جب ہم کہتے ہیں کہ انسانیت ناقابل تقسیم وحدت ہے تو اس سے ہماری یہی مراد ہوتی ہے۔

امام ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں کہ :

وَيَجِبُ بَذْلُ الْجُهْدِ عَلٰى اَهْلِ الْآرَائِ الْكُلِّيَّةِ فِىْ اِشَاعَةِ الْحَقِّ وَتَمْشِيته وِاخْمَالِ الْبَاطِلِ وَصَدِّه فَرُبَّمَا لَمْ يُمْكِنْ ذٰلِكَ اِلاَّ بِمُخَاصَمَاتٍ اَوْ مُقَاتَلَاتٍ فَيُعَدُّ كُلُّ ذٰلِكَ مِنْ اَفْضَلِ اَعْمَالِ الْبِرِّ (حجۃ اللہ البالغہ ج۱ ص ۵۰ طبع منیریہ مصر)

(جو لوگ انسانی معاشرے کی کلی اصلاح حال کے رنگ میں سوچتے ہیں ان پر واجب ہوتا ہے کہ اشاعت حق کرنے اور اسے معاشرے میں چلانے کے لئے اور باطل کا زور توڑنے اور اس کا نفاذ روکنے کے لئے پوری پوری (جانی

مالی) کوشش کریں لیکن اکثر یہ کوشش صرف ان شکلوں ہی میں ممکن ہو پاتی ہے کہ مخالفین حق کے خلاف نشر و اشاعت کی جائے اور قتال کیا جائے۔ اس صورت میں یہ دونوں اعمال بہترین نیکی کے اعمال شمار ہوتے ہیں۔)

ایسے ہی یہ بھی صحیح ہے کہ جب کوئی جماعت انسانی منافع میں سے کسی ایک حصے کی خدمت کے لئے اٹھے لیکن وہ اپنے آپ کو جامعہ انسانیہ (Human Society) کا ایک جزو تصور کرے تو اس کے پروگرام کا انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ غلط ہوگا کہ وہ جماعت اپنی جزوی خدمت کو کلی قرار دے کر دوسری جماعت کے خلاف صف آرا ہو جائے اور یہ تو اور بھی بڑی حماقت ہوگی کہ وہ کلی تحریک کا انکار کردے یا اس کی طرف التفات نہ کرے۔

الغرض ائمۂ ادیان ہی اصل میں جامعہ انسانیہ (Human Society) کے حقیقی امام ہوتے ہیں۔ جو لوگ انسانی سوسائٹی کے منافع میں سے چند ایک کو لے کر کام کرتے ہیں وہ انبیاء سے کم درجے کے لوگ ہوتے ہیں۔ جو اہل سیاست اور اہل فلسفہ و حکمت اور جو سائنسدان اپنے آپ کو ان ائمۂ دین کے تحت بطور جزوی کارکن لے آئیں وہ طبعی طور پر ان ائمہ سے دوسرے درجے پر شمار ہوں گے۔ جو شخص دین کے معنی سمجھتا ہے[1] اور اجتماعیت کا مفہوم بھی جانتا ہے، اور اہل سیاست و فلسفہ میں سے خدام انسانیت کی بھی پہچان رکھتا ہے، وہ ائمہ دین کے سوا کسی کو اجتماعیت انسانیہ کا امام تسلیم نہیں کرسکتا۔

عام مؤرخین، بین الاقوامی تحریک کی ابتداء سکندر مقدونی (Alexander of Macedonia) سے کرتے ہیں، لیکن ہماری تحقیق یہ ہے کہ عالمی انسانی تاریخ کا آغاز سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نسبت قرآن حکیم میں آیا ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (۲: ۱۲۴) "میں تجھے نوع انسانی کا امام بناؤں گا"۔ اور آپ نے دیکھا ان کی اولاد اس عالمی پیشوائی کے لئے کام کرتی رہی۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام ایسے ہی امام ہیں اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ انہی کی تحریک کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوئے ہیں۔

چونکہ قرآن حکیم بین الاقوامی تحریک پیدا کرتا ہے جس کی ابتداء سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کی اس لئے اس کی پہلی سورت میں "رَبُّ الْعَالَمِیْنَ" کا تصور دیا گیا ہے۔

---

[1] دین کی حقیقت سمجھنے کے لئے "حجۃ اللہ البالغہ" مصنف امام ولی اللہ دہلویؒ باب بیان اصل دین واحد والمناہج مختلفہ (ج۱) اور ابواب مابعد پڑھنے چاہئیں۔ اور اجتماعیت کے سمجھنے کے لیے اس کتاب کے ابواب ارتفاقات کا گہرا مطالعہ کرنا چاہئے، اور اس مطالعے کو "بدور بازغہ" مصنفہ امام صاحب کے مطالعے سے تقویت دینی چاہیے۔ (مرتب)

تفسیر سورۂ الفاتحہ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ﴿۱﴾ اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ﴿۲﴾ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ﴿۳﴾

تشریح الفاظ :

حَمۡدُ: جو فعل کسی کے اپنے علم واختیار اور ارادے سے صادر ہوا ہو، اس کی حقیقی تعریف کرنا۔ (مدح۔ کسی ایسی چیز یا فعل کی تعریف جو اختیاری نہ ہو جیسے حسن کی تعریف۔ ثناء، بار بار خوبیاں بیان کرنا)۔

ال: یا تو جنس کے لئے ہے۔ اس صورت میں اس سے مراد ہو گی حقیقی اور اصلی تعریف۔ یا استغراق کے لئے ہے۔ اس حالت میں اس سے مراد ہو گی "ہر قسم کی تعریف" اور "تمام تعریفیں"۔

ل: تخصیص کے لئے یعنی حقیقی حمد و تعریف اللہ ہی کے لئے ہے۔

اللہ: اسم ذات ہے یعنی وہ پاک ذات "حَقِیۡقَۃُ الۡحَقَائِقِ وَ وُجُوۡدُ اَقۡصٰی" جو ہمیشہ سے ہے، اور ہمیشہ رہے گی۔ وہی وجود کا منبع اور مصدر ہے، اور ہر ایک شے اسی سے اور اسی کے ارادے سے وجود پاتی ہے، وہی تمام مخلوقات کو قائم رکھتا ہے، اور ارتقاء (Evolution) کی منزلیں طے کراتا ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا صفاتی نام نہیں بلکہ اسم علم ہے۔ اگرچہ یہ غیر مشتق ہے، لیکن عربی زبان کی عام خوبی کے مطابق اس میں بھی ایک خصوصیت پائی جاتی ہے یعنی اس لفظ میں جذب اور کشش کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

چنانچہ عربی میں کہتے ہیں (ا) وَلَہَ الصَّبِیُّ اِلٰی اُمِّہٖ (بچہ گھبرا کر اپنی ماں کی طرف لپکا) وَلَہَتِ الۡاُمُّ اِلٰی وَلَدِہَا (ماں کا دل اپنے بچے کی طرف کھنچ گیا) گویا اللہ وہ ذات ہے، جس کی طرف ہر شے بلکہ کائنات کا ایک ایک ذرہ کھنچتا ہے۔ وہی سب کا محبوب اور سب کی محبت کا مستحق ہے، کیونکہ وہی حسن اور احسان کا مرکز ہے۔

اَلرَّحۡمٰنِ: (مادہ 'رحم'، دل پگھلنا، شفقت) اللہ تعالیٰ کی ایک تجلی جس کا تعلق تمام عالم (Cosmic Universe) کی تخلیق کے ساتھ ہے۔ بقول امام ولی اللہ دہلوی کائنات کا مادہ اسی تجلی سے وجود میں آیا۔ [1]

---

[1] سطعات۔ سطعہ سوم (مرتب)

الرَّحِيۡمِ : (مادہ 'رحم') اللہ تعالیٰ کی وہ تجلی یا صفت جس کا تعلق بندوں کے اعمال کی، دنیا اور آخرت میں جزا و سزا دینے سے ہے۔

رَبِّ : پرورش کرنے والا، اور تربیت کر کے تکمیل تک پہنچانے والا۔

الۡعٰلَمِيۡنَ : واحد : العالم (۱) جہاں، ساری دنیا (۲) مخلوقات کی تمام انواع (۳) اقوام

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ : (سب تعریف کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ رب العالمین نے قرآن حکیم کے ذریعے سے جو بین الاقوامی نظام قائم کیا ہے، وہ ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ اس میں کوئی نقص نہیں ہے۔

بہترین نظام :

یہ نظام جو اللہ تعالیٰ نے انسانی قوموں میں پیدا کیا ہے، اور جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہے، بہترین نظام ہے۔ اس سے بہتر نظام ذہن میں آنا ممکن نہیں۔ اس لئے انسان کو یہ نظام بین الاقوامی پیمانے پر چلانے میں اپنی ساری ہمت اور کوشش صرف کر دینی چاہیئے۔

بعض حکماء کا قول ہے کہ جو کچھ پیدا ہو چکا ہے اس سے بہتر پیدا ہونا ناممکن ہے۔ یہ قول حکمت انسانی کے کمال کا اظہار کرتا ہے، لیکن بعض دوسرے حکماء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے وہ اس سے بہتر بنا سکتا ہے اگر وہ نہ بنا سکے تو یہ اس کا نقص سمجھا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ بلند درجے کے حکماء کا قول ہے کہ اس کائنات کی نہ ابتداء ہے نہ انتہا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ موجودہ کائنات ہی ازلی و ابدی ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات مختلف ادوار میں منقسم ہے، اور ایک دور اپنے پہلے دور کا نتیجہ ہوتا ہے، اس طرح اقتضائے حکمت کے مطابق ادوار کا سلسلہ جاری ہے، یہ کہیں ختم ہونے میں نہیں آتا۔ لیکن ایک انسان کو تفصیلی علم صرف ایک دور ہی کا ہو سکتا ہے، پچھلے اور آنے والے دوروں کا اسے علم نہیں ہو سکتا البتہ عقل سلیم اسے لازماً تسلیم کرتی ہے کہ چونکہ تعطل صفات الٰہی ناممکن ہے، اس لئے یہ سلسلہ ضرور قائم و دائم رہنا چاہیئے ہمیں ادوار کا علم ہو سکے یا نہ ہو سکے۔

اب اصل سوال لیجئے کہ کیا جو کچھ ہے اس سے بہتر ممکن ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "ہاں" اور "نہیں"۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ اس سے بہتر ممکن ہے، وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک دور سے

دوسرا دور بہتر ہونا ممکن ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا، وہ اصل میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ موجودہ دور میں جو چیز پیدا ہوئی ہے، وہ اس دور کی فطرت کے عین مطابق ہے اور اس دور میں اس سے بہتر ممکن نہیں۔ [1]

ہماری غرض اس سارے بیان سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو ایک خاص فطرت کے ساتھ پیدا کیا ہے، یہ ممکن ہی نہیں کہ اس سارے نظام میں موزون ہونے کے لئے اس سے بہتر چیز وجود میں آسکے۔ جو بہترین چیز اس نظام عالم میں وجود میں آنی ممکن تھی وہ وجود میں آچکی۔ اس لئے فطرت انسانی میں، جو تمام اقوام اور افراد میں مشترک ہے اور انسانی اجتماعیت کی بنیاد ہے، کوئی نقص نہیں پایا جاتا۔ اس لئے یہ تعلیم جس پر انسانیت کو منظّم کیا جارہا ہے بہترین تعلیم ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے لائق حمد و ستائش ہے۔

جب یہ صاف ستھری معرفت اچھی طرح انسان کے دل میں جم جاتی ہے، تو وہ دین اسلام کو دل سے قبول کرلیتا ہے، اور اسے اچھی طرح سے سمجھ جاتا ہے، اگر یہ معرفت اس کے دل میں راسخ نہ ہو وہ لادینی بن جاتا ہے اور وہ راہ راست سے بھٹک کر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا ہے۔ آیئے اب اس آیت پر ایک اور پہلو سے نظر ڈالیں۔

اچھی اور بری چیزیں:

دنیا میں دو قسم کی فکر رائج ہے۔

ایک فکر کے مطابق کوئی چیز اچھی ہے یا بری ہے، جو چیز اچھی ہے، وہ بنی ہی اچھی ہے، اور ہر ماحول میں اچھی ہی رہتی ہے، جو بری ہے وہ بنی ہی بری ہے، وہ اچھے ماحول میں بھی بری ہی رہتی ہے۔

دوسرا خیال یہ ہے کہ اصل میں کوئی چیز بری نہیں ہے، وہ کسی ماحول میں بُری بن گئی ہے، اگر اس کا ماحول بدل دیا جائے تو وہ بُری نہیں رہے گی۔ [2]

---

[1] اس کی مثال یوں سمجھنا چاہئے کہ ایک کاریگر گھڑی بناتا ہے اس کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ اس کے پرزے اس میں اس طرح وابستہ ہیں کہ اس کی تخلیق کے مقصد کو بہترین انداز پر پورا کرتے ہیں۔ اس سے بہتر وابستگی ممکن نہیں۔ اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ اس سے بہتر کوئی اور گھڑی بنانا ممکن نہیں ہے جو گھڑی اس سے بہتر بنے گی اس کے اپنے پرزوں میں سے ہر ایک پرزہ اس کے لئے بہترین ہوگا کیونکہ وہ اس گھڑی کے مقصد تخلیق کو بہترین طور پر پورا کرے گا۔ (مرتب)

[2] جب کوئی قوم اپنے بلند درجے سے گر جاتی ہے اور اشیاء کی حقیقت پر غور کرنا اور اپنا حساب لینا چھوڑ کر بے فکری اختیار کرلیتی ہے تو یہ نظریہ اختیار کرلیتی ہے کہ ہر شے اپنی فطرت میں اچھی یا بری ہے ماحول کے بدل جانے سے اس کی اچھائی برائی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ یہ خیال اس لئے بنالیتی ہے کہ وہ اپنے بدلے ہوئے برے ماحول کی وجہ سے اپنے میں کسی برائی کی قائل نہیں ہونا چاہتی۔ وہ اپنی گراوٹ پر قناعت کرلیتی ہے اور یہ سوچ کر اطمینان کرلیتی ہے کہ بلا سے ماحول بگڑ گیا تو کیا ہوا ہم تو اچھے ہی ہیں وہ ان خوبیوں کی جو وہ اپنے مخالفوں میں پاتی ہے قائل نہیں ہونا چاہتی، کیونکہ اگر وہ اپنے مخالفوں میں خوبیاں تسلیم کرلے تو اسے اپنے برے ماحول کو بدل کر وہی خوبیاں اپنے اندر پیدا کرنی پڑتی ہیں۔ یہ ایک انقلاب ہے جس سے وہ عادی ہو چکی ہے حقیقت یہ ہے کہ جب تک یہ نظریہ انقلاب اس کے اندر نہ آئے اس کی حالت کا تغیر ناممکن ہوتا ہے۔ (مولانا عبیداللہ سندھیؒ)

صحیح اصول یہ ہے کہ کوئی چیز اپنی فطرت میں بُری نہیں۔ ایک چیز خاص حالات میں ایک خاص ضرورت پوری نہیں کرتی اسے بُری کہہ دیا جاتا ہے۔ اشیاء کو انسان کے نوعی تقاضوں کے مطابق دیکھا جائے تو کسی چیز کی اچھی یا بُری ہونے کا معیار یہ ہوگا کہ وہ چیز انسان کے ان تقاضوں کے ساتھ موافقت رکھتی ہے یا مخالفت۔ اچھی چیز وہ ہے جو انسان کے نوعی تقاضوں کے موافق ہے اور بُری چیز وہ ہے جو انسان کے نوعی تقاضوں کی مخالف ہے۔ یہ ہے وہ اصول جو امام ولی اللہ دہلویؒ پیش کرتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ :

فَكَذٰلِكَ لِلْبِرِّ سُنَنٌ اَلْهَمَهَا اللهُ تَعَالٰى فِىْ قُلُوْبِ الْمُؤَيَّدِيْنَ بِالنُّوْرِ الْمَلَكِيِّ الْغَالِبِ عَلَيْهِمْ خُلُقُ الْفِطْرَةِ بِمَنْزِلَةِ مَا اَلْهَمَ فِىْ قُلُوْبِ النَّحْلِ مَا يُصْلِحُ بِهٖ مَعَاشَهَا فَجَرَوْا عَلَيْهَا وَاَخَذُوْا بِهَا وَاُرْشِدُوْا اِلَيْهَا وَحُثُّوْا عَلَيْهَا فَاقْتَدٰى بِهِمُ النَّاسُ وَاتَّفَقَ عَلَيْهَا اَهْلُ الْمِلَلِ جَمِيْعُهَا فِىْ اَقْطَارِ الْاَرْضِ عَلٰى تَبَاعُدِ بُلْدَانِهِمْ وَاخْتِلَافِ اَدْيَانِهِمْ بِحُكْمِ مُنَاسَبَةٍ فِطْرِيَّةٍ وَاقْتِضَاءٍ نَوْعِيٍّ (حجۃ اللہ البالغہ ج۔ا ص ۵۸)

(ایسے ہی اچھائی کی شکلیں ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے ان اشخاص کے دلوں میں بذریعہ الہام ڈالی ہیں جن کی ملکی نور مدد کرتا ہے، ان پر فطرتی خلق غالب ہوتا ہے، اس کی مثال ویسی ہی ہے جیسے شہد کی مکھی کے دل میں وہ طریقے ڈالے گئے جن کے مطابق وہ معاشی زندگی بسر کرتی ہے، چنانچہ ان لوگوں نے وہ طریقے اختیار کر لئے اور ان پر کام کرتے رہے اور دوسرے لوگوں کی بھی رہنمائی کرتے رہے، اور انہیں ان کے اختیار کرنے کی تاکید کرتے رہے، پھر لوگوں نے ان کی پیروی شروع کر دی، اور اس طرح سب ملتوں کے لوگ کرۂ زمین کے مختلف خطوں میں بستیوں کے دور دور ہونے اور مذہبوں کے اختلاف کے باوجود زندگی بسر کرنے کے لئے ان طریقوں پر متفق ہوگئے، اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ان سب گروہوں کے افراد میں ایک فطری مناسبت موجود ہے، اور وہ سب ایک نوعی تقاضے سے متاثر ہوتے ہیں)۔ ❶

اس کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ جو چیز انسان کے لئے بُری ہے، ہوسکتا ہے کہ کسی اور مخلوق کے لئے اچھی ہو۔ ❷

ان دونوں اصولوں کے جمع کر لینے سے معلوم ہوا کہ کائنات میں کوئی شے بُری اور غیر مفید ہے ہی نہیں۔ بلکہ ہر ایک شے کسی نہ کسی لحاظ سے، کسی نہ کسی حالت میں، کسی نہ کسی مخلوق کے لئے مفید ہی ہے کوئی چیز بیکار اور فالتو نہیں۔ جو چیز وجود میں آئی ہے اس کا وجود میں آنا ضرور تھا۔ کائنات کو جو فائدہ اس شے سے حاصل ہوسکتا ہے وہ کسی

---

❶ اس موضوع کے مزید مطالعے کے لئے ملاحظہ ہو، حجۃ اللہ البالغہ (۱) باب انشقاق التکلیف من التقدیر (ص ۲۰) (۲) باب کیفیۃ استنباط الارتفاقات (ص ۳۸) (۳) باب حقیقۃ السعادۃ وغیرہ (مرتب)

❷ جیسے کاربن ڈائی آکسائیڈ (Carbon Dioxide) جو حیوانات کے تنفس کے لئے مضر ہے لیکن نباتات کے لئے مایۂ حیات ہے۔ (مرتب)

اور شے سے حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔[1] اس سے بہر حال ہر شے کو وجود میں لانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنا پڑتی ہے جس نے کائنات کے ذرے ذرے کو مفید بنایا اور کسی نہ کسی حکمت کے تحت پیدا کیا ہے۔

حمد الٰہی کے چار گوشے : انسان اس بات کو کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کی حمد و ستائش کا مستحق ہے، چار پہلوؤں میں سمجھ سکتا ہے۔

(۱) وہ رب العالمین ہے (۲) وہ الرحمٰن ہے

(۳) وہ الرحیم ہے، اور (۴) وہ مالک یوم الدین ہے۔

"رَبُّ الْعَالَمِيْنَ"

رَبُّ : اس کے معنی ہیں کسی شے کو تدریجاً نشو و نما دے کر تکمیل تک پہنچانے والا (راغب)، انسانیت کی تکمیل یہ ہے کہ انسان وہ مقصد سمجھ لے جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے اور اس میں فنا ہو جائے۔ یعنی اس مقصد کی تکمیل کے سوا اور کسی کام کا خیال اس کے ذہن میں نہ آئے یہ انفرادی درجہ تکمیل ہے۔

الْعَالَمِيْنَ: یہ جمع ہے عالم کی۔ اس کے تین معنی ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کے سوا باقی تمام چیزیں۔

(۲) مخلوقات کی مختلف قسمیں مثلاً عالم موالید (Organic World) عالم جمادات (Inorganic World)

(۳) مختلف انسانی اقوام (Groups)

"رَبُّ الْعَالَمِيْنَ" کے معنی : اس میں شک نہیں کہ تمام کمالات الٰہیہ مخلوقات کے ذریعے ظاہر ہوتے ہیں، اور ذات الٰہی ان کمالات کی وجہ سے لائق حمد و ستائش ہے، لیکن ذرا غور کیا جائے تو اس سورت میں تیسری معنی زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ تمام انبیاء کرام کی دعوت کا موضوع ہمیشہ اجتماعیت انسانی (Human Social Order) ہی رہا ہے اور وہ انسانی سوسائٹی (مجتمع) کی ہر قسم کی اصلاح کے لئے آتے ہیں۔[2]

---

[1] امام ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں کہ : "وَنَحْنُ نَعْلَمُ قَطْعاً اَنَّهٗ لَا يُوْجَدُ شَيْئاً اِلَّا وَهُوَاَحَقُّ اَنْ يُوْجَدَ" (حجۃ اللہ البالغہ ج۔۱ص ۱۷ص ۲۳) یعنی ہم پورے یقین کے ساتھ جانتے ہیں جو شے وجود میں لائی جاتی ہے اس کا وجود میں لایا جانا ہی سب سے زیادہ ضروری ہوتا ہے (ورنہ وہ وجود میں لائی نہ جاتی)۔ (مرتب)

[2] انبیاء کی بعثت کی غرض، امام ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں : "اس میں شک نہیں کہ انبیاء کی آمد کی اصل غرض و غایت تو یہ ہوتی ہے کہ عبادات کی ضروری شکلوں کی تعلیم دیں لیکن وہ اس کے ساتھ ہی رسوم فاسدہ کی بندش اور بہترین ارتفاقات کے اختیار کرنے کی ترغیب کو بھی اپنے اصل مشن کا جز بنا لیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہرگز نہیں چاہتا کہ انسان اجتماعیت کے ارتفاق دوم اور ارتفاق سوم مہمل چھوڑ دے۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی نے بھی ان ارتفاقات کے ترک کر دینے کا کبھی حکم نہیں دیا، وہ ہمیشہ ارتفاقات میں راہ اوسط اختیار کرنے کا حکم دیتے رہے ہیں۔" (حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص ۱۰۴) (مرتب)

خصوصاً خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا خصوصی مقصد ہی یہ ہے کہ انسانیت کی فطرت کے تحت تمام اقوام کے لئے عمومی اجتماعی تحریک کی تکمیل کریں۔ [1]

جب قرآن کریم کا یہ مقصد ہے اور سورۂ فاتحہ اس کا خلاصہ ہے تو اس سورت میں رب العالمین کے یہ معنیٰ ہی زیادہ موزوں ہیں کہ وہ اقوام کا پروردگار ہے۔

"رَبُّ الاقوام":

بیشک انسان اللہ تعالیٰ کو اپنے الٰہ (معبود و محبوب) کی حیثیت سے جانتا ہے اور اپنے رب کی حیثیت سے پہچانتا ہے لیکن جب وہ عالمی تحریک شروع کرے تو اسے طبعی طور پر اپنے رب کو رب العالمین (رب الاقوام) کی حیثیت سے جاننا اور پہچاننا ہو گا یعنی اسے یہ اچھی طرح سمجھ لینا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اس کا اپنا رب یا اس کے خاندان یا قبیلے ہی کا رب نہیں ہے بلکہ تمام اقوام عالم کا رب ہے۔ [2] اور تمام اقوام کو ارتقاء کے اس درجے تک پہنچائے گا جس کے لئے اس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ کسی کو آگے اور کسی کو پیچھے۔ اس آگے پیچھے کرنے میں بھی حکمت ہے۔

حقیقت میں ہر ایک قوم انسانیت عامہ کا ایک حصہ ہے، لیکن اب ہر ایک نے اپنی زمین (Territory) اور اپنا آسمان (Airspace) الگ الگ کر لیا ہے۔ کسی قوم کو دوسری قوم کے زمین و آسمان سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس کے باوجود ان سب حصوں، قوموں میں بنیادی انسانیت موجود ہے، جس حصے میں انسانیت اچھی طرح سے ظاہر ہوتی ہے وہ حصہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس کے نیچے دوسری اصناف بہ تدریج پیدا ہونے لگتی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ہے وہ انسان کے دل و دماغ کو پالتا ہے تاکہ وہ اپنا مقصد حیات حاصل کرنا سیکھے، یعنی جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ، "کیا

---

[1] حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی غرض: امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ: چونکہ ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تمام ملتوں میں خلل پڑ چکا تھا، ارتفاقات خراب ہو چکے تھے اور یہ حالت نہایت بری حد تک پہنچ چکی تھی، اس لئے اب حق اس غرض سے نازل ہوا کہ جہاد (انقلاب) جاری کیا جائے۔ عبادات کی اشاعت کی جائے۔ اور انہیں اوقات معینہ پر ادا کرنے کی تاکید کی جائے اور ایرانی اور رومی سلطنتوں کو ختم کر کے ان کی جگہ نبوی نظام حکومت بین الاقوامی پیمانے پر قائم کیا جائے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے خیر و برکت کا وہ دروازہ کھولا جو پہلے نہیں کھلا تھا، اور اس ذریعے سے ایسی جماعت (امہ) منظّم کی جو تمام انسانوں کے لئے بہترین جماعت تھی (تفہیمات الٰہیہ، ج۔۱، ص: ۸۳۔۸۲) (مرتب)

[2] ہر ایک قوم کی ہدایت کے لئے مختلف درجوں کے رہنمایانِ انسانیت پیدا ہوتے رہے۔ اور انسانیت آگے بڑھی۔ اب تمام اقوام مل کر رفتہ رفتہ ایک بننا چاہتی ہیں۔ لیکن وہ اس وقت دو بڑے حصوں میں بٹی ہوئی ہیں (ا) مشرقی بلاک (Eastern Block) مغربی بلاک (Western Block) قرآن حکیم کے نزول کے وقت بھی کم و بیش یہی حالت تھی وہ ان دونوں کیمپوں کو ملانا چاہتا ہے۔ شرق و غرب (ا) کے اس اجتماع کے لئے کتاب عظیم کام دے گی۔ اس لئے یہ کتاب، اللہ تعالیٰ کا تعارف "رب العلمین" کی حیثیت سے کراتی ہے یعنی سب قوموں کو ملا کر انسانیت کو ترقی دینے والا۔ اس اجتماع انسانیت کی تکمیل کے بعد ہی یہ سمجھ میں آئے گا کہ اجتماع کامل کے درجے، قبائلیت، شعوبیت، قومیت، طے کرنے پڑتے ہیں وہ سب ضروری اور لابد تھے اور انسانیت سے یہ سب نہایت قابل تعریف طریقے سے طے کرائے گئے ہیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (عبیداللہ سندھیؒ)

جائے" انسان وہ اپنی مرضی سے کرنا سیکھے۔

انسان اپنی نوعی ترقی کے دوران میں مختلف علاقوں میں پھیلتا رہا۔ آب و ہوا اور دیگر جغرافیائی حالات کے اختلاف سے انسانی نوع کا ایک حصہ دوسرے حصوں سے الگ تھلگ ہو گیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ہر ایک حصے کی بولی (زباں) بھی الگ الگ ہو گئی اور اس طرح مختلف علاقوں میں رہنے والے انسان جغرافیائی اور لسانی اختلافات کی وجہ سے مختلف قومیں بن گئے۔

جب قرآن حکیم آیا، یہ تقسیم انتہا کو پہنچ چکی تھی، اور انسانیت کی تکمیل کا دوسرا دور شروع ہونے والا تھا، جس میں مختلف قوموں کے درمیان میل جول بڑھے گا اور ایک دوسرے کے قریب آئیں گی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی انسانیت میں تین بنیادی چیزیں ودیعت فرمائی ہیں۔

(ا) رائے کلی، یعنی انسانی اجتماع کی خدمت کا جذبہ، جس کی وجہ سے وہ اپنے اجتماع میں نظام صالح پیدا کرنے، انفرادی اور اجتماعی اخلاق کی اصلاح کرنے اور حیات مابعد الممات (مرنے کے بعد کی زندگی) کی تیاری کرنے کی طرف توجہ کرتا ہے اور اپنے اجتماع میں اپنی وجاہت قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

(۲) حُبِ جمال، جس کی وجہ سے وہ اپنی تخلیقات میں افادے کے علاوہ حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

(۳) عقل و درایت: عقل انسان کو کسی چیز کی اشد ضرورت کا احساس دلاتی ہے، اور درایت اس مشکل کے حل کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔

انسانیت کے یہ تین خاصے اس کے بنیادی خاصے ہیں۔ یہ تینوں ہر ایک انسانی اجتماع میں پائے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہر ایک اجتماع انسانی میں ارتفاقات معاشی اور ارتفاقات عقلی پیدا ہوگئے۔ ارتفاقات معاشیہ سے مراد، ان آلات وغیرہ کی ایجاد ہے جن سے انسان کی مادی زندگی کی مشکلات کم ہو جاتی ہیں، مثلاً گھریلو اشیاء۔ اور ارتفاقات عقلی سے مراد ان فکری مسائل کا حل ہے جو انسان کو اپنی زندگی کے دوران میں پیش آتے ہیں۔ مثلاً مادے کی حقیقت، کائنات کی ساخت، ریاضی کے مسائل، تاریخ کے مسائل وغیرہ۔ امام ولی اللہ دہلویؒ کے قول کے مطابق انسان کی شہری زندگی، قومی زندگی اور بین الاقوامی زندگی انسان کی اس ارتقائی ترقی کا نتیجہ ہیں۔ [1]

"رَبُّ الْعَالَمِيْنَ": یعنی وہ نہ صرف افراد کی تربیت کرتا ہے، بلکہ انسانی اجتماعات (Group Life): خاندان، قبائل، شعوب، اقوام، بین الاقوامی اجتماعات کی بھی تربیت کرتا ہے۔ اس تربیت کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی انسانیت کو ترقی دے کر اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھے۔

---

[1] "حجۃ اللہ البالغہ" جلد اول ابواب ارتفاقات اور "بدور بازغہ" ابواب ارتفاقات (مرتب)

سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہر ایک انسانی اجتماع میں ایسے اہل عقل و درایت پیدا ہوتے رہے، جو انسانیت کے بنیادی تقاضوں کی تسکین کے لئے علم و حکمت معاشرے میں پھیلاتے رہے۔ یہ انبیاء کرام اور حکماء الٰہی تھی۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے انسانی ترقی کی نئی راہ کھولی، یعنی انسانی داخلی نفسی کیفیات پر زیادہ اور مستقل توجہ کرنا۔ اب دنیا کی قومیں اس راہ پر تیزی سے چلیں گی۔ اور ان میں یہ بات پیدا ہوتی جائے گی کہ مختلف اجتماعات ایک مرکزی نقطے پر جمع ہو سکیں۔ یہ بین الاقوامیت کا نیا دور ہوگا۔ جو سابق سیاسی بین الاقوامی اجتماعات سے زیادہ پائیدار ثابت ہوگا۔ اس اختراع فائقہ کی تکمیل حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے قرآن حکیم کی تعلیم کے ذریعے سے کردی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رب العالمینی کا بلند ترین نقطہ ہے، جس پر وہ انسانیت کو پہنچانا چاہتا ہے۔ قرآن، ایک حکیم کو اس درجے تک پہچانا چاہتا ہے کہ وہ تمام انسانی کائنات کی حکمت سمجھ کر رب العالمین کو ہر لحاظ سے قابل تعریف سمجھے اور کہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ -"

قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کو "رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ" کی حیثیت سے اس لئے بھی پیش کرتا ہے کہ وہ نوع انسان کو ایک بین الاقوامی آئین دینا چاہتا ہے۔ ایسا قانون کوئی ایک شخص یا قبیلہ یا قوم نہیں بنا سکتی۔ ایسا قانون "رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ" ہی بنا سکتا ہے، جو فطرت انسانی کا خالق ہے۔[1] اس بین الاقوامی قانون میں قومی قانون بھی آجائے گا۔ لیکن اسی قدر جس قدر وہ بین الاقوامی کے ساتھ مناسبت رکھتا ہوگا۔

نظام ربوبیت :

اللہ تعالیٰ نوع انسانی کا رب ہے۔ اس نے انسان کی پیدائش سے پہلے ہی اس کی تربیت کا سامان پیدا کر رکھا ہے۔ جس طرح کائنات میں اس کی ربوبیت کا نظام ہر عیب سے پاک اور ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے اسی طرح انسان کو اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے اس نے جو دستور قرآن حکیم کی شکل میں دیا ہے وہ بھی ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔[2]

---

[1] فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (30:30) (مرتب)

[2] نوع انسان کی ربوبیت کے دو شعبے، امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ : اللہ تعالیٰ نوع انسان کا رب ہے، اس کی ربوبیت کے دو شعبے ہیں۔

(۱) تکوین نوع انسان (۲) تشریع برائے نوع انسان (یعنی انسان کو پیدا کرنا اور اس کی رہنمائی اور زندگی کی تنظیم کے لئے اسے قوانین دینا، امام صاحبؒ ان دونوں باتوں کو درخت کی مثال سے واضح فرماتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم زمین میں ایک درخت کا بیج بوتے ہیں، وہ بیج زمین میں سے پانی میں حل شدہ خوراک لیتا ہے اور کچھ غذا ہوا میں سے لیتا ہے اسی میں درخت کے نوعی تقاضے درجہ بدرجہ تصرف کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ درخت کے نوعی تقاضے خود اس بیج میں پوشیدہ تھے، وہی درخت کی صورت میں ظاہر ہو گئے اس کے پتے، پھول پھل، ذائقہ اور لکڑی کی خاصیتیں وغیرہ جن کے سبب سے ایک نوع کا درخت دوسری نوع کے درخت سے مختلف ہوتا ہے وہ سب اس بیج میں پوشیدہ طور پر پہلے سے موجود تھے۔

غرض اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسانیت کو نہایت اعلیٰ پیمانے پر پیدا کیا ہے اسی طرح سے فرد انسانی کو بھی بہت بلند معیار پر تخلیق کیا ہے [1] اگر انسانیت کی تقسیم اقوام میں ہو اور ہر ایک قوم اپنے اندر ایسا نظام پیدا کرلے جس میں افراد کے حقوق کی پوری پوری نگہداشت کی جائے اور وہ پوری طرح سے ادا بھی ہوتے رہیں اور افراد اپنے فرائض اس زندہ احساس کے ساتھ ادا کرتے رہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے آگے جوابدہ ہیں تو کسی کو انسانیت میں کوئی قابل اعتراض بات نظر نہ آئے گی اور اس پروردگار کی تعریف کرنی پڑے گی جس نے انسانی اقوام اور افراد کو ایک نظام کے اندر پیدا کیا اور سب کی رہنمائی کے لئے قرآن حکیم جیسا دستور حیات عطا فرمایا۔

اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انسانی معاشرہ ایسی طرز پر پیدا کردیتا کہ اس میں کوئی ٹکراؤ نہ ہوتا جیسے باقی ساری کائنات ہے لیکن اس کی حکمت نے چاہا کہ انسان اپنی سمجھ اور ہمت سے اچھا نظام قائم کرے اس کے لئے اسے عقل دی اور عقل کی مزید رہنمائی کے لئے وقتاً فوقتاً انبیاء علیم السلام بھیج کر انسانی جماعتوں کو تعلیم دیتا رہا۔ اب اس نے قرآن حکیم کی شکل میں بین الاقوامی دستور حیات بھیج دیا ہے اس لئے اب اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب انسان وہ ہے جو انسانی معاشرے میں قرآن حکیم کے مطابق نظام پیدا کرنے اور چلانے میں اپنی پوری ہمت صرف کردے۔ [2]

ایسے ہی مادہ حیوان کے پیٹ میں جنہیں اس حیوان کے نوعی تقاضوں کے مطابق پرورش پاتا ہے اور نوع کے قویٰ ادراکیہ اور قویٰ عملیہ ظاہر ہوتے ہیں اور حیوان کی حرکات نفس ساعت بہ ساعت قوت سے فعل میں آتی رہتی ہیں۔ انسان کی بالکل یہی کیفیت ہے بلکہ اس کے جنین میں نوع انسانی کے خاص ارتفاقات اور نفی مجازات، سعادت و شقاوت نوعیہ وغیرہ سب ظاہر ہوتی ہیں گویا نوع کے احکام ہی افراد میں ظاہر ہوتے ہیں، لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ "نوع" ایک قالب ہے وہ موثر بالذات نہیں، یعنی افراد پر اپنے ارادے سے اثر نہیں کرتا اور نہ وہی کسی تاثیر کا موجد حقیقی ہے، بلکہ جو حقیقی موجد تاثیر ہے یعنی خداوند تعالیٰ وہ قالب اس کے حکم کے مطابق عمل کرتا ہے جس طرح ایک ماہر سنگ تراش ایک خوبصورت مجسمہ گھڑتا ہے، تو وہ مجسمہ اصل میں سنگ تراش کی ذہنی تصویر کی شکل پر ہوتا ہے اسی طرح ہر ایک نوع کے احکام اور تقاضے حضرت واجب جل مجدہ کی ذات کے اقتضاء سے اس کے علم میں پوشیدہ تھے، ذات واجب میں یہ احکام تاثیر کی حیثیت میں تھے اور مخلوق میں یہی احکام تاثر کے رنگ میں ظاہر ہوئے۔

اس کے بعد امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ انواع اور نوعی تقاضے پہلے واجب جل مجدہ کے علم میں آئے اس منزل کو لوح محفوظ کہتے ہیں، اس کے بعد وہاں سے ایک تجلی کے ذریعے سے ملاء اعلیٰ کے اذہان میں آئے جو حامل عرش تکوین ہیں۔ اس کے بعد جب حالات سازگار پیدا ہوگئے تو 'انسان مقدر' انسان خارجی کی شکل میں ظاہر ہوگیا۔ اس مرتبے میں ربوبیت کے دو شعبے ہوگئے پہلا شعبہ ان احکام کا ہے جو زمانے کی قیود سے بالاتر ہے۔ ان احکام پر زمانے کی تبدیلی کا کوئی اثر نہیں پڑتا، مثلاً انسان میں ضحک (ہنسی) نطق، ارتفاقات ضروریہ اور نیکی اور بدی کے اصول جو نوعی تقاضے انسانی افراد کو اسی طرح بذریعہ الہام پہنچاتے ہیں، جیسے شہد کی مکھی یا چڑیا کو طبیعی الہام ان کی صورت نوعیہ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ دوسری ربوبیت ان احکام کے ذریعے سے ہوتی ہے کہ انسان ہر زمانے میں اپنی نوعی صورت سے مطابقت پیدا کرتا رہے اور نیکی اور بدی کے اصولوں کو ہر زمانے کے مناسب شکلوں میں اختیار کئے رکھے۔ (مرتب)

[1] لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (ہم نے انسان کو بہترین پیمانے پر پیدا کیا ہے) (التین 95:4) (مرتب)

[2] یہاں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ رب العالمین صرف اقوام و افراد کی تربیت نہیں کرتا، بلکہ وہ انسانی معاشرے میں پیدا ہونے والی تحریکات اور نظام ہائے ثقافت کی بھی تربیت کرتا ہے۔ چنانچہ ہر اذان کے بعد ہمیں جو دعا مانگنی سکھائی گئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّة وَالصَّلٰوةِ الْقَائِمَةِ الخ۔۔۔ اس میں دعوۃ (نماز کے لئے پکار) کی ربوبیت اور "الصلوۃ القائمہ" کی ربوبیت کی دعا مانگی گئی ہے یہ دعاء اس لئے سکھائی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو ایک عظیم الشان تحریک کے بانی اور ایک نظام کے قائم کرنے والے ہیں وہ مقام محمود حاصل کریں اس مقام محمود کا وعدہ آپ سے اس آیت میں کیا گیا ہے۔ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (17:79) تیرا (رب عنقریب تجھے مقام محمود پر فائز فرمائے گا) مقام محمود قرآن حکیم کا بین

کائناتوں کا خالق:

اللہ تعالیٰ اس حیثیت سے بھی رب العلمین ہے کہ وہ تمام دنیاؤں کا خالق ہے۔ ❶

اس نے کروڑوں کائناتیں پیدا کر رکھی ہیں، ہر ایک کائنات پورے نظام کے ساتھ ایک جامع قانون کے تحت ترقی و ارتقاء کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ کائنات عظمیٰ کی ایک اہم مخلوق، انسان کو بغیر کسی رہنمائی اور دستور حیات کے چھوڑ دیتا؟ بڑی کائنات میں ایک ایک ذرہ قانون کے تحت کام کر رہا ہے۔ ساری کائنات میں کامل آہنگی اور باقاعدگی پائی جاتی ہے۔ ❷ کرۂ زمین پر ہر ایک نوع کی زندگی کے خاص قاعدے ہیں۔ وہی ان کی "شریعت" ہیں اور وہ اس شریعت کے تحت چل رہا ہے۔ یہ شریعت اس نوع حیوان کی فطرت کے تقاضے پوری کرتی ہے۔ انسان کی بھی ایک فطرت ہے اس کی رہنمائی کے لئے بھی ایک دستور حیات ہونا چاہئے۔ وہ قرآن حکیم ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ضابطے اور دستور کے ذریعے سے تمام اقوام کو اپنی انسانی فطرت کی تکمیل تک پہنچانا چاہتا ہے۔

الاقوامی غلبہ عظیم ہی ہے۔ جو ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کو حاصل ہو چکا ہے، جب بنی عباس نے بغداد میں بین الاقوامی مرکز قائم کیا اور پھر ہند میں مسلمانوں نے اسی قسم کا مرکز قائم کیا۔ لیکن اس کا ظہور کامل اس وقت ہوگا جب تمام انبیاء کی قومیں لوائے محمدی کے نیچے آجائیں گی اور قرآن حکیم کے قانون کی فرمانبرداری کرنے لگیں گی۔ (مرتب)

❶ کائنات کی وسعت: کائنات عظمیٰ (سب سے بڑی کائنات جو تمام کائناتوں پر مشتمل ہے) اس میں ہمیں اپنی دوربینوں Telescopes کی مدد سے بیس لاکھ جزیرائی کائناتیں (Island Universes) دکھائی دیتی ہیں۔ ایسی کائناتیں جو ہماری ناقص دوربینوں کی پہنچ سے باہر ہیں ان کی تعداد کروڑوں ہوگی ہم خود ایک جزیرائی کائنات" میں بستے ہیں جسے کہکشائی کائنات (Galaxtic Universe) کہتے ہیں کیونکہ یہ اس کہکشاں (Galaxy) میں واقع ہے جو رات کو ہمیں آسمان پر دکھائی دیتی ہے۔

یہ جزیرائی کائناتیں سحابوں (Nebulac)[(۱)] کی شکل میں نظر آتی ہیں اور ہماری کہکشائی کائنات سے لاکھوں نوری سال[(۲)] کے فاصلے پر واقع ہیں۔ ہمارا نظام شمسی (solar system) اس لمبے کہکشاں کے اندر ستاروں کے ایک جھرمٹ Star Cruster میں واقع ہے جس میں ایک اندازے کے مطابق 47 ہزار ملین (ملین = دس لاکھ) اور دوسرے اندازے کے مطابق ایک لاکھ ملین ستارے (سورج) لیں۔ Chapter I & ii Ctowther. J.G. An outline of Universe (مرتب)

❷ کائنات میں ہم آہنگی: قرآن حکیم کی سورت الملک میں آتا ہے کہ مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ هَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ۝ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ كَرَّتَیۡنِ یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡكَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیۡرٌ ۝ (۶۷: ۴-۳) (یعنی کیا تجھے خدائے رحمٰن کی تخلیق میں کوئی فرق نظر آتا ہے؟ پھر دوبارہ نگاہ کر، کہیں تجھے فتور دکھائی دیتا ہے، پھر لوٹا لوٹا کر دو دفعہ نگاہ دوڑا تیری نگاہ درماندہ ہو کر اور تھک ہار کر واپس آجائے گی اور کائنات میں کہیں کوئی فرق و فتور نہ پائے گی۔ ان آیات کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر صاحب (مشیر سائنس برائے صدر پاکستان) نے کراچی یونیورسٹی میں ۱۲ فروری ۱۹۶۵ء کو ایک لیکچر دیا جس کا عنوان مادے کے بنیادی ذرات (Fundamental Particles of Matter) تھا، اس لیکچر میں ڈاکٹر صاحب نے اعلان کیا کہ ساری کائنات میں انتہا درجے کی یکسانیت اور موزونیت پائی جاتی ہے اور کہیں کوئی فرق یا بے قاعدگی دکھائی نہیں دیتی۔ (مرتب)

(ذیلی حاشیہ) (۱) مادے کے روشن بادل:

(۲) ایک نوری سال (Light Year) سے وہ فاصلہ مراد ہے جو روشنی کی کرن ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی ثانیہ (سیکنڈ) کی رفتار سے چلتی ہوئی ایک سال میں طے کرتی ہے۔ یہ پانچ کھرب اٹھاسی ارب میل سے زیادہ ہے۔ علم ہیئت میں ستاروں وغیرہ کے فاصلے اتنے لمبے شمار میں آتے ہیں کہ جلد ہی ہمارے ہند سے ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ان فاصلوں کو میلوں میں ظاہر کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان بے حد طویل فاصلوں کے ظاہر کرنے کے لئے نوری سال کو اکائی مان کر کہا جاتا ہے کہ فلاں ستارہ دس نوری سال یا دس ہزار نوری یا دس لاکھ نوری سال کے فاصلے پر واقع ہے۔ (مرتب)

"اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ"

ان دونوں لفظوں کا مادہ 'رحم' ہے، جسے سب جانتے ہیں، یہ اس سلوک سے معلوم ہو سکتا ہے جو ماں باپ اپنی اولاد سے کرتے ہیں۔

"آنحضرت ﷺ کے زمانے میں ایک عورت کسی غزوے میں گرفتار ہو کر آئی، اس کا بچہ گم ہو گیا تھا، اس کے دل میں محبت کا جوش تھا کہ بچہ مل جاتا اسے سینے سے لگا لیتی، اور دودھ پلاتی! آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو حاضرین سے فرمایا کہ "یہ ہو سکتا ہے کہ یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال دے؟" لوگوں نے عرض کیا "ہرگز نہیں!" فرمایا: "خدا کو اپنے بندوں سے اس سے کہیں زیادہ محبت ہے"۔

ایک دفعہ ایک صحابی آنحضرت ﷺ کے حضور میں ایک پرندہ مع اس کے بچوں کے چادر میں لپٹا ہوا لایا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! میں ایک جھاڑی میں سے یہ بچے اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لایا۔ اس کی ماں یہ دیکھ کر میرے سر پر منڈلانے لگی۔ میں نے ذرا کپڑا کھول دیا تو یہ فوراً بچوں پر گر پڑی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اپنے بچوں کے ساتھ ماں کی محبت پر تمہیں تعجب ہے، قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے! جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا تعالیٰ کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ بدرجہا زیادہ رحمت کے ساتھ اپنے بندوں کو دیکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے ایک سو حصوں میں سے ایک حصہ دنیا میں نازل فرمایا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ماں باپ کو اپنی اولاد سے محبت ہے، انسان کو انسان سے محبت ہے، حیوان کو حیوان سے محبت ہے۔

دنیا میں انسان کی تربیت ماں باپ کے ذریعے سے ہوتی ہے (دوسرے حیوانوں کی زندگی کا بھی عموماً یہی قاعدہ ہے) پھر ایک وقت آتا ہے کہ ماں باپ کی ضرورت نہیں رہتی، اور خود، کسی انسانی فرد کا ماں یا باپ بن جاتا ہے۔ اس وقت وہ اپنی اولاد کے لئے ویسی ہی رحمت اور محبت اپنے اندر پاتا ہے جیسی اس کے ماں باپ خود اس کے لئے ظاہر کرتے تھے۔

دنیا میں جتنے "ماں باپ" آج تک ہو چکے ہوں یا قیامت تک ہوں گے (انسان کے ہوں یا حیوانوں کے) ان سب کی مہر پدری اور محبت مادری کو جمع کر کے اسے سوگنا کر لیا جائے، تو اللہ تعالیٰ کے رحم کا کچھ اندازہ لگ سکتا ہے۔

رحمٰن اور رحیم :

ذرا غور کیا جائے تو باپ اور ماں کی محبت میں ایک طبعی فرق نظر آتا ہے۔ باپ چاہتا ہے کہ اس کی اولاد کمال

حاصل کر لے خواہ اولاد کو کتنی ہی مشقت کیوں نہ اٹھانی پڑے۔ ماں کی مامتا چاہتی ہے کہ اس کی اولاد کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا جو پہلو باپ کی محبت سے مشابہ ہے وہ رحمانیہ ہے، اور جو ماں کی محبت کی مانند ہے وہ رحیمیہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمانیت چاہتی ہے کہ انسان مشقتیں اٹھا کر بھی کمال کے درجے طے کرتا رہے، چنانچہ سورۃ رحمٰن میں آتا ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (۵۵: ۱-۲) (رحمٰن وہ ہے جس نے قرآن سکھایا)

اب قرآن حکیم پڑھنا، پڑھانا اس کے اصول کی اشاعت کرنا، ان پر جماعت تیار کرنا اس کے دستور کو دوسرے دستوروں پر غالب کرنا اور اس کی حفاظت کے لئے لڑنا مرنا یہ سب رحمانیت کا تقاضا ہے۔

اس کی رحیمیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے محبوب بندے اپنے اعمال کے نتائج سے بہترین فائدے حاصل کریں، اور ہر قسم کی تکلیف، غم اور خوف سے محفوظ رہیں۔

چنانچہ سورۃ الشعراء میں مومنوں اور کافروں کا تقابل کیا گیا ہے۔ کافروں کی نسبت بتایا گیا ہے کہ انہیں عذاب دیا جائے گا اور وہ مغلوب ہوں گے اور مومن پر رحم کیا جائے گا۔ وہاں اللہ تعالیٰ اپنی صفات کا ذکر فرماتا ہے، یعنی "وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ" (۲۶:۹) (تیرا رب ہی عزیز اور رحیم ہے) گویا العزیز ہے بمقابلہ کفار جنہوں نے خدائے عزیز کی عزت کے خلاف کام کیا۔ یہ لوگ ضرور عذاب میں مبتلا ہونے چاہئیں۔ اور الرحیم ہے مومنوں کے ساتھ اس لئے وہ انہیں جنت میں جگہ دے گا، جہاں انہیں کوئی تکلیف اور زحمت نہ ہوگی۔ پس قرآن حکیم میں جہاں کہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ذکر آئے گا، وہ ان دو معنوں میں سے کسی معنیٰ میں آئے گا اور اس کا مرجع یہ بنیادی آیت کریمہ ہوگی۔

بچہ ماں باپ کے بھروسے ہی پر ترقی کر سکتا ہے، جہاں ماں باپ کی قوتیں جو اب دیتی جائیں اور "اَلرَّحْمٰنَ" اور "اَلرَّحِيْمَ" پر انسان کا بھروسہ بڑھتا جائے وہ اپنی فطرت کے مطابق ترقی کرتا چلا جاتا ہے اور اس کی انسانیت تکمیل کو پہنچ جاتی ہے اور اس طرح انسانی فطرت کی طلب پوری ہو جاتی ہے۔

رحمت کی وسعت:

"اَلرَّحْمٰن" اور "الرَّحِيْمَ" کی رحمت کی وسعت کا اندازہ لگانے کے لئے "رَبُّ العٰلمين" کی طاقت کا اندازہ لگاؤ۔

وہ تمام کائناتوں کو ارتقاء کی منزلوں سے گزار رہا ہے۔ وہ انسانی جماعتوں کے لئے ترقی کی راہیں کھولتا ہے اور ان کی ہدایت اور رہنمائی کا سامان کرتا ہے، اگر انسان اتنی وسیع طاقت کے مالک "رَبِّ الْعٰلَمِيْن" پر بھروسہ کرنا سیکھ لے جس کی محبت اور رحمت تمام دنیا کے ماں باپوں کی محبت سے سینکڑوں گنا وسیع ہے اور جس کی طاقت (تجلی) تمام کائناتوں کے گوشے گوشے تک پہنچتی ہے، توانسان کی ترقی کی راہ میں کون سی چیز رکاوٹ بن سکتی ہے؟

تمام کائناتوں کا ظہور اللہ تعالیٰ کی رحمانیت ہی سے ہوا ہے، ان کائناتوں کے اندر ارتقاء کے جو قوانین جاری ہیں، اور اس کی رحیمیت نے انسان کی راحت کے لئے جو سامان اس زندگی کے لئے اور مرنے کے بعد کی زندگی کے لئے پیدا کر رکھے ہیں، ان کا جتنا علم انسان کو ہوتا جاتا ہے اتنا ہی وہ اس بات کا قائل ہوتا جاتا ہے کہ خدائے رحمٰن و رحیم کے تمام کام ہر لحاظ سے قابل تعریف اور لائق ستائش ہیں۔

نوٹ: اس سورت کا 'رب العلمین' سورۃ الناس کے 'رب الناس' ہی کا قائم مقام ہے۔

"مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ"

نظام عدل کی ضرورت:

جنگل کے درختوں اور پودوں کو ربوبیت الٰہی غذا بہم پہنچاتی ہے، تو وہ نشو و نما پاتے ہیں، اور بڑھتے بڑھتے ان کی شاخیں آپس میں پھنس جاتی ہیں، اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی مالی ہو جو انہیں الگ الگ کر دے اور ضرورت ہو تو چھانٹ ڈالے تاکہ وہ اپنے حلقے میں بڑھتے رہیں۔ یہ عدل و انصاف کا تقاضا ہے۔

اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کی ربوبیت مختلف استعداد کے انسانوں کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور ان کی انفرادی فطرت کی تکمیل کرتی ہے تو طبعی طور پر ان میں اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں، جب یہ اختلافات بڑھتے ہیں تو معاشرے (Society) میں ایک فرد دوسرے فرد پر ظلم کرنے لگتا ہے، اب جو شخص اس معاشرے کو باہر سے دیکھے گا وہ فرشتوں کی طرح یہی کہے گا "اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ" (۲: ۳۰) (کیا تو کرہ زمین پر ایسی مخلوق پیدا کرنی چاہتا ہے جو اسے خراب کرے اور خون ریزی کرے) لیکن جو شخص اسے اندر سے دیکھے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ انسان کے ہر فعل کا کوئی سبب ضرور ہوتا ہے اور یہ سلسلہ اسباب مسلسل چلا جاتا ہے۔ انسانی معاشرے کے اندر سلسلہ ظلم و طغیان بھی سلسلہ اسباب سے خارج نہیں ہے، یہ انارکزم (Anarchism) نہیں ہے۔

انسانی معاشرے میں بعض اسباب کے زیر اثر ظلم و طغیان کا ظہور ہوا تو حکمت الٰہی نے اسے یونہی نہیں چھوڑ دیا کہ انسان کٹ کٹ کر فنا ہو جائیں، بلکہ اس نے نظام عدل پیدا کرنے کا اہتمام فرمایا۔ انسان اپنی ترقی کے لئے جس

طرح اللہ تعالیٰ کی رحمت کا محتاج ہے جو اس کی ربوبیت کی تفسیر ہے، اسی طرح عدل حق کا بھی محتاج ہے جو اللہ تعالیٰ کی مالکیت اور ملوکیت کا ترجمان ہے۔ خدا تعالیٰ کی یہ مالکیت اور ملوکیت سب سے زیادہ واضح شکل میں انسانی نظام ہی میں ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ اس کی قدرت اور قہرمانی باقی تمام غیر ذی ارادہ اشیاء پر ان کے ارادے کے بغیر ہی قائم ہے، لیکن انسان خود اپنے ارادے اور فیصلے سے اللہ تعالیٰ کی حکومت اپنے اوپر تسلیم کرتا ہے۔ دونوں میں کتنا فرق ہے! پس اس سورت کا "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" سورہ الناس کا "مَلِكِ النَّاس" ہی ہے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ معاشرۂ انسانی کے قیام و قوام اور ترقی کے لئے ایک نظام عدل کی ضرورت ہے، وہ بادشاہت کے ذریعے سے قائم ہو یا عوامیت اور جمہوریت کے ذریعے سے قائم ہو۔ کسی طرح سے بھی ہو۔ [1]

---

[1] امام ولی اللہ اور نظام عدل: امام ولی اللہ دہلویؒ نظام عدل کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

(ا) ارتفاق ثالث، اس کی حقیقت یہ ہے کہ اصول مذکورہ کے مطابق انسان کے لئے تمدنی زندگی لازم ہے کیونکہ حقیقت میں شہر سے مراد فصیل، منڈی اور بلند عمارات نہیں ہیں، بلکہ اس سے مختلف انسانی جماعتوں کے مابین ارتباط مراد ہے، اور اصول مذکورہ کی رو سے مختلف جماعتوں میں ارتباط پیدا ہو جانا طبعی طور پر لازم ہے۔ یہ تمام انسانی جماعتیں آپس کے معاونات اور معاملات کی وجہ سے ایک شخصیت پیدا کرلیتی ہیں، لیکن یہ شخصیت معنوی ہوتی ہے اور خارجی یا داخلی اسباب اس کی شخصیت میں صحت اور مرض کی حالت پیدا کرتے رہتے ہیں، لہٰذا شہر کے لئے ایسے طبیب کی ضرورت ہے جو حتی الامکان اس کی صحت قائم رکھے اور اگر مرض کی کیفیت پیدا ہو جائے تو اس کا معالجہ بھی کرسکے۔ امام مع اپنے کارندوں کے تمدن کا طبیب ہوتا ہے۔ (البدور البازغہ: ص: ۵، ص: ۱۸ تا ۱۵۱، ص: ۴)

(ب) ایک اور جگہ مدینہ (شہر) کی تعریف بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: اس میں (یعنی شہر میں) البتہ ایک وحدت ہوتی ہے تو اس وحدت کا صحت کے ساتھ قائم رکھنا لازم ہے تاکہ تمدنی زندگی کے منافع کی تکمیل ہوسکے تو وہ تدبیر (نظام) جس سے صحت قائم رہتی ہے اور تکمیل منافع ہوتی رہتی ہے وہی حقیقت میں امام ہے وَلَيْسَ الْاِمَامُ عِنْدَنَا هُوَ شَخْصُ الْوَاحِدِ الْاِنْسَانِيِّ (ہمارے نزدیک امام کوئی انسانی فرد نہیں ہوتا) البتہ اگر کوئی انسانی فرد شہر کا حاکم بن جائے اور وہ یہ نظام قائم کرنے کی استعداد بھی رکھتا ہو گو وہ اپنی ذات سے آمر مطلق ہی کیوں نہ ہو اور شہری زندگی (اس کے عمل سے) پوری صلاحیت سے چلے تو اس لفظ کے ظاہری معنوں کے لحاظ سے وہ بھی امام کہلا سکے گا۔ (ایضاً ص ۷۱۔۷۲)

(ج) شہری زندگی کی تنظیمی ضروریات پر بحث کرنے کے بعد امام صاحب فرماتے ہیں: چونکہ مدینہ تامہ لوگوں کی کثیر تعداد جمع ہو جانے اور ان کی طبیعتوں اور غرضوں کے اختلافات کی وجہ سے آراء کے اختلافات کے باعث کسی نظام کا قیام مشکل ہو جاتا ہے، اس لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت پڑتی ہے جو نظام قائم کرسکے ایسا شخص جو مذکورہ بالا (پانچوں صفات) کا حامل ہو امام برحق ہوتا ہے لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اکثر اوقات جو امر واقع ہوتا ہے یہ ہوتا ہے کہ ایک صفت ایک شخص میں پائی گئی اور دوسری کسی میں اور باقی کسی اور میں۔ یہ مدینہ ناقصہ میں ہر ایک ضرورت کے لئے ایک رسم موجود ہوتی ہے جس پر سب کا اتفاق ہوتا ہے یا ایک ایک پیشے کے لوگوں کا چوہدری ہوتا ہے جس کی رائے مانی جاتی ہے یا اِجْتِمَاعٌ مِنْ عُقَلَاءِ الْقَوْمِ وَمُدَبِّرِيْهِمْ (قوم کے عقلمندوں اور سربرآوردہ لوگوں کا اجتماع) ہوتا ہے جو نظام قائم رکھتا ہے۔ (ایضاً ص ۷۳۔۷۴) ایک اور جگہ (ایضاً ص ۱۸۱) عقلاء کی جگہ "حکماء" بھی فرماتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب دنیا کا رجحان اس طرح ہے چنانچہ پی۔ اے سائزوکن ہاورڈ یونیورسٹی لکھتے ہیں کہ

Three significant trends in the qualifications of the new governments are already observable. The first of these trends manifests itself in the rapidly increasing role of scientists and expert in the planning developing controlling and executing of an ever-increasing part of the important governing activities and policies." (Sorokin P.A. The Basic Trends of our Times. College and University Press. New Haven. Coun U.S.S. P.55.

نئی حکومتوں کے اوصاف میں تین معنی خیز رجحانات نمودار ہوتے صاف دکھائی دینے لگے ہیں، پہلا رجحان حکومتوں کی انتظامی سرگرمیوں اور پالیسیوں کی منصوبہ بندی، تکمیل، نظم و نسق اور تعمیل و نفاذ میں حکماء (سائنسدانوں) اور (ہر شعبہ حیات کے) خصوصی ماہرین کی سرعت سے بڑھتی ہوئی اور زیادہ سے زیادہ حصہ داری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

"انسانیت" ذمہ داری کا نام ہے :

انسان کی "انسانیت" میں اعلیٰ جوہر یہ ہے کہ وہ ایک بات سمجھ لے اور پھر اسے عمل میں لائے اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کا ذمہ اٹھائے۔ وہ اینٹ پتھر نہیں ہے کہ ہلایا تو ہل گیا ورنہ ساکن پڑا ہے۔

ہم اپنی روزانہ زندگی میں "نوکر" اور "غلام" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ نوکر اور غلام خود سوچ کر اپنی ذمہ داری پر کوئی کام نہیں کر سکتے، اس لئے ان پر "انسان" کا لفظ پوری طرح صادق نہیں آتا۔ اصل میں انسان کا ترجمہ حر (آزاد) ہے، یعنی وہ خود سوچ کر اپنی ذمہ داری سے کام کرتا ہے۔

اس جوہر حریت کو ترقی دینے اور پایہ تکمیل تک پہنچانے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ انسان کو یقین دلایا جائے کہ خدائے رحمٰن و رحیم نے اس کی ترقی کے تمام سامان پیدا کر دیئے ہیں۔ اگر وہ ان اسباب سے کام لے اور اپنے فرائض ادا کرے تو اس کی ترقی کے لئے وسیع میدان موجود ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے فرائض ادا کرنے میں کوتاہی کرے تو اسے سزا بھگتنی ہوگی، کیونکہ اس کے اعمال کے نتیجے پیدا کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے "ہر ایک انسان اپنے اعمال کے نتیجے میں گروی ہے"۔ (۳۸:۷۴) اور وہ اس نتیجے سے کسی صورت میں بھی بچ نہیں سکتا۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے اس نتیجے سے آزاد نہیں کر سکتی۔

انسان میں یہ یقین جتنا زیادہ قوی ہوگا وہ اتنا ہی اعلیٰ درجے کا نظام پیدا کر لے گا اور اسے چلائے گا اور جتنے زیادہ انسانوں کو یہ یقین حاصل ہوگا اتنی ہی انسانیت ترقی کرے گی۔ جتنا یقین کمزور ہوگا اتنی ہی انسان کی انسانیت کمزور ہوگی۔ وہ کام کرے گا لیکن اپنے آپ کو اپنے کاموں کے نتیجوں کا ذمہ دار نہیں سمجھے گا ایسا شخص انسان نہیں نرا حیوان ہے وہ جتنا ظلم کرے کر سکتا ہے۔

عمل اور اس کا نتیجہ :

امام ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے فعل کی تکمیل سے پہلے اس کا نتیجہ مرتب نہیں ہوتا، جونہی اس کا فعل پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے، اس کا نتیجہ جزا یا سزا مرتب ہو جاتا ہے، گو کبھی کبھی وہ نتیجہ فی الفور ظاہر نہیں ہوتا۔ پس انسان اپنے تمام اعمال میں "مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ" کا محتاج ہے جو اس کے اعمال کے نتائج مرتب کرے۔

دین کے معنی ہیں جزا۔ ہر ایک حرکت کا نتیجہ نکلنا ایک کائنات گیر قانون ہے، اس کے عمل کو نظام کلی (Universal) کہتے ہیں۔ اس نظام کلی کے تحت انسان کے اعمال کی جزاء (یا سزا) مرتب ہوتی ہے، اسے قانون مجازات بھی کہتے ہیں۔

امام ولی اللہ دہلویؒ، کے نزدیک انسان کو اس دنیا میں بھی جزاءِ اعمال ملتی ہے اور مرنے کے بعد بھی۔ چنانچہ انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ (ج:۱) میں "مبحث کیفیۃ المجازاۃ فی الحیاۃ و بعد الممات" کے عنوان سے ایک مستقل بحث لکھی ہے۔

بقول امام صاحب قانون مجازات کی اصل (Basic Application) حیوانات بلکہ نباتات میں بھی ہے، چنانچہ اگر حیوان ضرورت سے زیادہ چارہ کھالے تو اسے تخمہ (اپھارہ) ہو جاتا ہے، یا اگر زہریلی بوٹی کھا جائے تو سخت درد شکم میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی اگر درخت اپنی طبعی ضرورت سے زیادہ پانی جذب کرلے تو اس کا پھل خراب ہو جاتا ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ چونکہ انسان کو نہایت ذکی اور لطیف نفس دیا گیا ہے، اس لئے اس کے حق میں مجازات دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے، یعنی: قسم اول، ان افعال کے بارے میں جن کا تعلق بدن انسانی کے ساتھ ہے جیسے زیادہ کھا جانے سے تخمہ (اپھارے) میں مبتلا ہو جانا، یا زہر کھا کر مر جانا یہ افعال جان بوجھ کر کئے جائیں یا غلطی سے سرزد ہوں، یا کسی کے جبر و اکراہ سے کرنے پڑیں، ان افعال کا اثر ضرور نکلتا ہے۔ ان افعال میں یہ شرط نہیں ہے کہ کرنے والے نے اپنے ارادے سے جان بوجھ کر کئے ہوں۔

قسم دوم، ان افعال کے بارے میں جو انسان کا نفس اپنے ارادے اور اختیار سے کرتا ہے اور اس کا نفس ناطقہ ان کا رنگ اپنے اندر لیتا ہے۔

امام صاحب جزاء کے چار موطن (Levels) قرار دیتے ہیں۔

(۱) اس دنیا میں (۲) عالم برزخ میں

(۳) عالم حشر میں اور (۴) مجازات اجتماعی یعنی نوع انسان کی کلی جزاء۔

اس موضوع پر امام صاحبؒ نے تفہیمات الٰہیہ میں تفصیل سے لکھا ہے اس کی طرف رجوع کرنا چاہئے (دیکھیے تفہیمات الٰہیہ)

یوم الدین کی ضرورت:

(۱) اللہ تعالیٰ نے انسان کے اعمال کے نتائج مرتب کرنے اور اس کے کاموں کا بدلہ دینے کے مختلف قاعدے مقرر کر رکھے ہیں۔ اسے کسی نہ کسی قاعدے کے مطابق دنیا یا آخرت میں اس کے عمل کا اچھا یا برا بدلہ مل کر رہتا ہے۔ فرض کرو کہ بعض خاص حالات میں کسی شخص کو اپنے عمل یا اعمال کا بدلہ نہیں ملا۔ مثلاً سزا سے بچ گیا یا جزا پانے سے محروم رہ گیا، تو ضرورت ہے کہ ایک دن ایسا ہو جب اسے اس کے اعمال کی پوری پوری جزا یا سزا ملے

اسے 'یوم الدین' کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ جس وسیع اور غیر محدود طاقت کے ساتھ تمام کائناتوں کا انتظام کرتا ہے اور تمام دنیا کی قوموں کی ترقی کے سامان بہم پہنچاتا ہے تو اسی وسیع اور لامحدود طاقت کے ساتھ ہر ایک انسان سے اس کے اعمال کی باز پرس بھی کرے گا اس سے وہ مالک یوم الدین کہلاتا ہے۔ ❶

(۲) کسی انسان کا ایک فعل لمحوں میں تکمیل نہیں پاتا۔ اس لئے ممکن ہے کہ اس کے عمل کا نتیجہ دنوں، ہفتوں، یا برسوں میں نکلے، لیکن اگر کوئی بہت بڑا اجتماع کوئی عمل کر رہا ہو تو وہ صدیوں سے پہلے تکمیل نہیں پا سکتا۔ اس کا نتیجہ بھی صدیوں ہی میں مرتب ہو سکتا ہے۔ اجتماعیت عامہ میں جس میں تمام اقوام اور ساری کی ساری انسانیت شریک ہو جو عمل ہو رہا ہے وہ انسانیت کے ساتھ ہوتا رہے گا، یہاں تک کہ وہ پایہ تکمیل تک پہنچ جائے اور کرۂ زمین سے انسانیت ختم ہو جائے۔ کیا انسانیت عامہ کے نوعی اجتماعی کام کی جانچ (Assessment) کے لئے کوئی وقت نہیں ہونا چاہئے؟ جس طرح افراد انسانی اور چھوٹے انسانی اجتماعات کے اعمال کی جانچ پڑتال ہوتا ہے، اسی طرح نوع انسانی کی اجمالی اور اجتماعی جانچ پڑتال بھی ہوگی یہ کام اللہ تعالیٰ نے "یوم الدین" پر اٹھا رکھا ہے۔ ❷

(۳) معاشرے میں بعض لوگ اس کام پر مقرر ہوتے ہیں کہ لوگوں کو ان کے اعمال کی جزاء دیں لیکن یہ جزا دینے والے بھول چوک سے یا جان بوجھ کر غلطی کر جاتے ہیں، اس غلطی کا تدارک بعض اوقات اس دنیا میں ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایک یوم الدین ہو جس میں حاکموں اور فیصلہ کرنے والوں کے غلط فیصلوں پر نظر ثانی کی جائے اور لوگوں پر جو ظلم ہوا ہو اس کا تدارک کیا جائے، یہ بھی یوم الدین پر موقوف ہے۔

(۴) خدائے رحمان و رحیم انسانوں کو جتنی نعمتیں عطا فرماتا ہے، اگر انسان ان کے متعلق یہ سمجھ لے کہ اسے ان سب نعمتوں کا حساب دینا ہوگا، تو وہ ہر موقع پر سوچ سمجھ کر کام کرے گا۔ اور کسی نعمت کو ضائع نہیں کرے گا، قرآن حکیم فرماتا ہے کہ: لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ (۲: ۲۸۴) یعنی "آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے، وہ سب اللہ کی ملکیت ہے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے وہ ظاہر کرو یا چھپائے رکھو ہر حالت میں اللہ تعالیٰ اس کا حساب لے گا۔"

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو بڑی مشکل بات ہے اور پھر آگے اس آیت کی تشریح میں تقریریں بناتے ہیں۔

---

❶ تمام انبیاء اور آسمانی کتابیں یہی بات انسان کو سمجھانے کے لیے آئی ہیں۔ کبھی کسی نبی کے ذریعے سمجھائی گئی ہے کبھی اس کے قائم مقام کے ذریعے سے جسے حکیم کہتے ہیں۔ (عبیداللہ سندھی)

❷ سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ (ہم عنقریب تم دونوں گروہوں کے لئے فارغ ہو جائیں گے) (الرحمٰن ۳۱: ۵۵) (مرتب)

کیاانہوں نے انسانیت اور اس کی ذمہ داری کو اتنا ہی آسان سمجھ لیا ہے؟ خدا تعالیٰ نے اتنی مخلوق پیدا کر کے انسان کو اپنا خلیفہ (نائب) کے طور پر ان سب پر حاکم بنایا ہے۔ کیا وہ "اَحْکَمُ الْحَاکِمِیْنَ" کو اپنے نائب کی حیثیت سے حساب دینے سے انکار کرتے ہیں؟ تو گویا وہ انسان نہیں بننا چاہتے۔ یہ لوگ کہتے ہیں: کہ آیت "رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا" (۲۸۶:۲) آیت محاسبہ کی ناسخ ہے، حالانکہ ایسا نہیں وہ اس کی تکمیل کرتی ہے۔ اصل میں ان لوگوں کا کام ہی یہی ہے کہ تمام کام کی آیتوں کو بیکار بنا کر رکھ دیں، ہمارا فکر یہ ہے کہ ان لوگوں نے بچوں کو سکھانے کے لئے تفسیریں لکھیں تھیں (بڑی عمر کے لوگ تو زندگی کے تجربوں سے قرآن آسانی سے سیکھ لیتے ہیں) ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن پر عمل کر کے دکھا دیا ہے، اب ناسخ و منسوخ کا کوئی سوال ہی نہیں رہا۔ سارا قرآن اصل اور قابل عمل ہے۔

حدیث شریف (مسلم) میں آیا ہے کہ قیامت کے روز خدا تعالیٰ ہر ایک انسان سے الگ الگ سوال و جواب کرے گا، اس میں یہ جملہ بھی آیا ہے کہ "میں نے تجھے رزق دیا تو نے مجھے روٹی نہ دی!"۔ بندہ کہے گا 'یا اللہ! تو، تو بھوک پیاس سے پاک ہے، تجھے روٹی کیا دیتا؟' اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ: "یہ عاجز بھوکا انسان تیرے پاس آیا۔ تو نے اسے روٹی نہ دی، اگر اسے روٹی دے دیتا تو وہ مجھے پہنچ جاتی"۔ پھر جماعت سے سوال ہو گا کہ تم نے اس نبی کی بات کیوں نہ مانی؟ الغرض زندگی کی تمام نعمتوں کا حساب اللہ تعالیٰ کے ہاں ہو گا۔

(الف) ایک نعمت ایک انسانی فرد کو دی گئی ہے، اس کا حساب اسے دینا ہو گا۔

(ب) ایک نعمت ایک جماعت (قوم) کو دی گئی ہے، اس کا حساب اسے دینا ہو گا۔

(ج) جو نعمتیں انسانیت عامہ کو دی گئی ہیں ان کا حساب ساری انسانیت کو دینا ہو گا۔

اس غرض کے لئے ساری انسانیت کا، میدان حشر میں جمع کیا جانا ضروری ہے، تاکہ سب کا انفرادی اور اجتماعی حساب لیا جائے۔ یہ حساب "یَوْمُ الدِّیْن" ہی کو ممکن ہے۔

انسان کو یہ بات کہ 'اسے خدا تعالیٰ کے روبرو جواب دینا ہو گا' اپنی زندگی کے تمام درجوں میں یاد رکھنی چاہئے۔

(د) اللہ تعالیٰ نے بے شمار مخلوق پیدا کر کے، انسان کو اس کا حاکم بنا دیا ہے وہ ان سے کام لیتا ہے اور فائدے اٹھاتا ہے کیا "اَحْکَمُ الْحَاکِمِیْن" اپنے نائب سے اس کی ذمہ داریوں کا حساب نہ لے گا؟ جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں وہ گویا انسان نہیں بننا چاہتے۔

مختصر یہ کہ انسانیت کی ترقی کے لئے ایک نظام عدل کی ضرورت ہے جس کے تحت قانون مکافات پوری طرح

سے عمل کرے، لیکن اسے انسان کو موجودہ زندگی میں ایسے حالات اور قوانین کے تحت کام کرنا پڑتا ہے کہ ان قوانین کے طبعی تقاضوں کی وجہ سے قانون مکافات اپنا پورا عمل نہیں کر سکتا۔ [1]

اس لئے نہ افراد اور اقوام کے ظلموں کی پوری سزا مل سکتی ہے، نہ حاکموں کے ارادی اور غیر ارادی غلط فیصلوں کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ نیز افراد، اقوام اور انسانیت عامہ کے کام جاری رہتے ہیں، جن کا انجام اس وقت ہوگا جب نوع انسان کا خاتمہ ہوگا۔ ایسے ہی افراد، اقوام اور انسانیت عامہ کو جو نعمتیں دی گئی ہیں ان کے استعمال کا حساب نوع انسان کے خاتمے ہی پر لیا جا سکتا ہے۔ یہ سب امور نوع انسانی کے اس دور کے خاتمے پر ایک یوم الدین کا تقاضا کرتے ہیں، جب پورا پورا حساب لیا جائے اور مکمل عدل کیا جائے۔ یہ دن ضرور آئے گا اور اس وقت اللہ تعالیٰ حساب لینے اور انصاف کرنے کے سوا اور کوئی کام نہ کرے گا۔

یوم الدین پر ایمان کا فائدہ:

جب انسان یوم جزا کی معرفت پر پورا یقین کر لیتا ہے، تو وہ اس بات سے بے فکر ہو جاتا ہے کہ اس کا کوئی حق مارا جائے گا یا وہ معاشرے کی خدمت کے لئے جو کام کرے گا جزا سے محروم رہ جائے گا۔ وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ اگر اس حکمت الٰہی کے تقاضے کے مطابق اس کے کسی عمل کی جزاء اسے دنیا میں نہیں مل سکی یا جو ظلم اس پر ہوا اس کی اصلاح نہیں ہو سکی تو "یَوْمُ الدِّیْن" پر اسے وہ جزا مل جائے گی اور اس روز اس کی پوری داد رسی کی جائے گی۔ اس امر کے کامل یقین ہی سے انسانیت کی تنظیم کی قوت قاہرہ پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اگر انسان کو آخری یوم جزا کا یقین نہ ہو یا وہ اسے تسلیم نہ کرتا ہو، تو وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں اپنے آپ کو اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں سمجھتا اور ظلم کرنے سے نہیں جھجکتا۔ اس ذہنیت کے انسان کسی معاشرے میں اوپر آ جائیں تو وہ بے انتہا ظلم کر سکتے ہیں۔

غرض دنیا اور آخرت میں "مُجَازَاۃ" (اعمال کی جزا) کا جو سلسلہ کام کر رہا ہے، وہ ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے اور اس تعریف کا اصل مستحق اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے یہ سلسلہ جاری کر رکھا ہے اور اسے اپنی حکمت اور قدرت کے ساتھ چلا رہا ہے۔

رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ، اَلرَّحْمٰنِ، اَلرَّحِيْم اور مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْن نے اللہ تعالیٰ کی ذات کا تعارف بخوبی کرا دیا۔ ان تمام

---

[1] امام ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں کہ: جب ان اسباب میں جن پر فیصلے کا اجراء موقوف ہے طبعی طور پر تعارض پیدا ہو جائے اور اس فیصلے کے مطابق جو حالات پیدا ہونے چاہئیں ان کا کلی طور پر وجود میں لانا ممکن نہ ہو تو اس وقت حکمت الٰہی ان اشیاء کی رعایت کرتی ہے (یعنی ان اسباب کو کام کرنے دیتی ہے) جو خیر مطلق کے زیادہ قریب ہوں"۔ (حجۃ اللہ البالغہ، ج۱، ص۱۷، ص۱۸) (مرتب)

صفتوں کا مرجع ذات واحد ہے جسے اللہ کہا گیا ہے۔ ساری کائنات پر اس کی ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت اور مالکیت کے نقطہ نگاہ سے نظر ڈالو اور فرد، خاندان، قوم، بین الاقوامی اجتماع اور انسانیت عامہ میں ان صفات کے ظہور و عمل پر غور کرو۔ اللہ تعالیٰ کے کسی فعل و عمل میں کوئی عیب نظر نہیں آتا اور ان ذات والا صفات کی ہر لحاظ سے تعریف کرنی پڑتی ہے۔

ان صفات کا تصور انسان میں اخبات کا گہرا جذبہ پیدا کر دیتا ہے اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے "اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ!"

جب انسانیت کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ معین ہوگیا اور یہ معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ تمام اقوام کا رب (پرورد گار) ہے اور اس کی ربوبیت انسانی معاشرے میں ماں باپ کی ربوبیت جیسی لیکن اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور تمام جھگڑوں کو چکانے والا (مَالِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ) وہی ہے اور وہی مظلوموں کے حقوق ظالموں سے لے کر دے سکتا ہے، تو انسانیت کو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کس کی حکومت درکار ہے؟ اس حالت میں انسانیت فقط اللہ تعالیٰ ہی کی حکومت، حاکمیت، ملوکیت اور مالکیت کو قبول کر کے ترقی کر سکتی ہے۔

جب انسانیت اپنے آپ کو اللہ، "ربُّ العٰلمین" اور "ربُّ النَّاس" کے ساتھ باندھ لے، تو وہ کبھی حسرت میں مبتلا نہیں ہوسکتی۔ یہ معنی ہیں "اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ" کے۔ گویا ہم اعلان کرتے ہیں کہ اللہ رب العزۃ کے سوا ہم کسی کے غلام نہیں ہیں۔ ہم اسی کی غلامی کرتے ہیں اپنے سارے دل کے ساتھ، اپنی ساری عقل کی معرفت کے ساتھ اور اپنے اعضاء و جوارح کی پوری تابعداری کے ساتھ۔ اب کوئی غیر اللہ ہم سے اس قسم کی پیروی، اطاعت اور فرمانبرداری کی امید نہ رکھے۔

(ا) اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں)

ہم تیری ہی حکومت تسلیم کرتے ہیں۔ تیری کتاب دستور۔ قرآن حکیم، کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کریں گے!

عبادۃ کیا ہے؟:

جب کوئی شخص قرآن حکیم کو بطور کتاب الٰہی تسلیم کر لے تو اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اسے پڑھنے میں اتنی محنت کرے کہ اس کا اطمینان ہو جائے کہ میں نے اس کا مطلب ٹھیک ٹھیک سمجھ لیا ہے اب وہ اس کتاب عظیم کے کسی حکم کی تاویل کر کے اسے منسوخ کہہ کر ٹال نہیں سکتا وہ اس کے ہر ایک حکم کی خوشدلانہ تعمیل کرے گا یہی عبادۃ ہے۔

قرآن حکیم میں ایک جگہ آیا ہے "اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ" (۷۵: ۱۷) امام ولی اللہ دہلویؒ کے نزدیک اس کے یہ معنی ہے کہ "صحابہ کرام نے جس طرح قرآن حکیم جمع کیا وہ گویا خداوند تعالیٰ نے جمع فرمایا ہے" آگے آتا ہے "وَقُرْاٰنَهٗ" (یعنی ہم پر اس کا پڑھانا بھی واجب ہے) اس سے مراد یہ ہے کہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ ایسے لوگ پیدا فرماتا رہے گا جو قرآن کو سمجھ کر آگے لوگوں کو سمجھاتے رہیں گے۔ اگر الفاظ قرآن حکیم کے پڑھے جائیں اور مطلب اپنا، لیا جائے تو یہ قرآن پڑھنا نہیں ہوگا۔ جب ہم قرآن حکیم کے کسی لفظ، کسی حرف یا کسی شوشے کو نہیں بدلتے تو اس کے معنی کو کیوں بدلیں۔

"اِخْبَاتِ اِلَی اللہ":

جب ساری کائنات میں ایک ہی اللہ کا قانون جاری ہے اور ہر ایک انسان اور ساری نوع انسانی اس کے آگے جوابدہ ہے تو کامیاب سوسائٹی وہی ہوگی جس میں اللہ تعالیٰ اور صرف اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کیا جائے، اسی سے محبت کی جائے اسی کے قانون کو تسلیم کیا جائے اور اس کی پابندی کی جائے اسے 'اخبات' کہتے ہیں۔

ہم اپنے ماں باپ، اپنے اساتذہ، روحانی مشائخ اور عادل حکام کی عزت کرتے ہیں، اور ان کے لئے اپنے دلوں میں عزت، محبت اور اطاعت کا جذبہ رکھتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کو "رَبٌّ"، "رَحْمٰنَ" "رَحِيْم" اور "مالكِ يَوْمِ الدين" تسلیم کر لینے کے بعد اخبات کے وہ تمام جذبات جو ہم ماں باپ، اساتذہ، مشائخ اور حکام کے لئے اپنے دل میں پاتے ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ اب ہم ان سے جو محبت کرتے ہیں اور ان کی جو اطاعت کرتے ہیں وہ خدا کی محبت اور اس کی اطاعت کے نیچے آجاتی ہے۔ ہم ان سے محبت کریں گے۔ اور ان کی اطاعت کریں گے کیونکہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرتے اور کراتے ہیں۔ اب ہماری زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف اس لئے ہوگا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے قانون کو عمل میں لائیں اور اس کے مقابلے میں اپنے نفس کی ہر ایک خواہش، ماں، باپ، عزیز و اقارب، دوست احباب کی ہر ایک خواہش، استاد اور مرشد اور حاکم کے ہر ایک حکم کو ٹھکرا دیں جو اللہ تعالیٰ کے کسی حکم سے ٹکرائے، کیونکہ اب ہم اللہ تعالیٰ کے غلام، اس کے بندے اور اس کے عبد بن چکے ہیں۔

یہ وعدہ کہ میں "تیری ہی بندگی کروں گا" بڑا ذمہ داری کا وعدہ ہے اس کا اقرار و اعلان کر دینے کے بعد انسان اپنا آپ اور اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کو سونپ دیتا ہے اور اس کا بن چکنے کے بعد وہ کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔

ہم خالص محبت کے ساتھ، دل کھول کر اور عقل کے ذریعے پوری معرفت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، پوری خوشی و خرمی کے ساتھ اپنے اعضاء و جوارح کو اس کے حکموں کی پیروی میں لگا دیتے ہیں اور غیر

اللہ کو کسی معبودیت کا حقدار نہیں سمجھتے۔

گو عبودیت کے معنی واضح ہیں، لیکن بعض اوقات اس لفظ کے مجازی استعمال سے شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے معنی معین کر دیئے جائیں، چنانچہ ان معنوں کی تعین اس آیت کے اگلے حصے میں کر دی گئی ہے۔

(ب) ”وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ“ ہم صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

ہم نے جو ذمہ داری قبول کی ہے اسے پورا کرنے کے لئے بہت سے سامان کی ضرورت ہو گی وہ ہم تجھ ہی سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لئے تجھ ہی سے مانگیں گے۔ ہمارے پاس کام کرنے والی سوسائٹیوں کی تاریخ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ انہوں نے خدا سے مانگا اور خدا نے انہیں دیا۔ [1]

غیر انقلابی کبھی مدد نہیں دیں گے :

جب کوئی جماعت قرآن حکیم کے اصول پر معاشرہ (سوسائٹی) تعمیر کرنے کے لئے اٹھے گی تو جو شخص یا جماعت اس انقلاب کو پسند نہیں کرتی، وہ کبھی اس انقلابی جماعت کو آگے بڑھنے نہیں دے گی، مدد دینے کا تو کیا ذکر! اس لئے قرآنی انقلابی جماعت کے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے مدد مانگنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

برعظیم ہند میں قرآنی اصول پر انقلاب لانے والی جماعت دو باتیں ہرگز قبول نہیں کرے گی۔

(۱) علمی سرمایہ داری (Brahmansim) اور (۲) معاشی سرمایہ داری (Cpaitalism)

جو لوگ قرآنی اصول پر انقلاب برپا کرنے کے لئے اٹھیں، انہیں صرف خدا تعالیٰ پر بھروسہ کر کے کام کرنا ہو گا یہ بھروسہ جتنا مضبوط ہو گا اتنی ہی خدا تعالیٰ کی طرف سے جلد اور زیادہ مدد حاصل ہو گی۔

توحید اور حریت :

اگر کوئی شخص ہمیں اس انقلاب میں کچھ مدد دیتا ہے اور اسکی مدد سے وہ اس بات کا حقدار نہیں بن جاتا کہ ہم اللہ

---

[1] چنانچہ امیر المومنین سید احمد (شہید) ۱۸۲۱ء میں حج کو جانے لگے تو آپ کے پاس صرف سو روپے کے قریب رقم تھی روانگی کے وقت آپ نے وہ روپیہ بھی غریبوں اور مسکینوں میں بانٹ دیا اور خالی ہاتھ گھر سے نکلے، حالانکہ آپ کے ساتھ چار سو سے اوپر لوگ تھے خدا کے بھروسے پر گھر سے نکلے۔ ایسے ہی کلکتے سے روانگی کے وقت آپ سارے بیڑے میں سے کمزور ترین جہاز میں سوار ہوئے اور فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ کی قدرت کے آگے نئے اور پرانے سب یکساں ہیں اگر وہ چاہے گا تو اس کو تیز کر دے گا“ اللہ کے فضل سے سارے بیڑے کے ساتھ آپ کا جہاز بھی وقت پر جدہ پہنچا۔ (سیرۃ سید احمد شہیدؒ از سید ابوالحسن علی ندوی جلد اول، ص ۲۷۷ اور ص ۳۲۰)

تعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں اس شخص کے حکم کی اطاعت کریں، تو ہم اس کی مدد کے لئے اس کا شکریہ ادا کر سکتے ہیں اور اس کی فیاضی کی تعریف بھی کر سکتے ہیں، لیکن خدا تعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں اس کا کوئی حکم نہیں مان سکتے۔ اس لئے کہ اصل میں تمام چیزیں اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ انہیں کسی ذریعے یا واسطے سے کسی دوسرے کو پہنچا دینا یہ حق پیدا نہیں کر دیتا کہ پہنچانے والے کی عبادۃ کی جائے۔ اگر وسائط کو ہماری بندگی کا حق حاصل ہو جائے تو انسانی معاشرے میں انارکی (نراج) پیدا ہو جائے۔ کیونکہ ہر ایک "واسطہ" ہماری اطاعت کا طلبگار بن جائے گا اور ہم کسی کو بھی مطمئن نہیں کر سکیں گے۔ جب انسان یہ بات اچھی طرح سے سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ اس کا خالق ہے اور وہی اس کی حاجتیں پوری کرنے والا ہے، تو وہ حاجت روائی کے لئے غیروں کے دروازوں پر سر نہیں جھکاتا۔ توحید کا یہی مطلب ہے اور انسانی حریت قائم رکھنے کا یہی طریقہ ہو سکتا ہے۔ اگر ہم یوں سوچنے لگیں کہ ہماری کوئی حاجت غیر اللہ بھی پوری کر سکتا ہے، تو ہمیں ہر ایک معطی کا بندہ بن کر رہنا ہو گا اور ہماری فکر و عمل کی آزادی چھن جائے گی۔ گویا "اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" (ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) اصل میں "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" (ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں) کا طبعی نتیجہ اور اس کی تشریح ہے پس کسی ترقی کن معاشرے کی بنیاد صرف اس اصول پر ہو سکتی ہے کہ ہم اپنی حاجتیں پوری کرنے میں اللہ کے سوا کسی اور پر بھروسہ نہ کریں۔

جب انسان اپنی ذمہ داری پر اپنی سوسائٹی پیدا کرنے کا ارادہ کرلے گا، ایسی سوسائٹی جس میں صرف انسانیت کے طبعی تقاضوں کے مطابق ضابطہ اور دستور جاری کرے گا، تو اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے مدد نہیں مل سکے گی اور نہ اسے کسی اور سے مدد لینی ہی چاہئے، اس لئے کہ ایسی سوسائٹی چلانے میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی مدد قبول کی جائے گی تو لامحالہ وہ اس کی قیمت وصول کرے گا اور اپنی غلامی کرائے گا جس سے انقلاب ختم ہو جائے گا، اور رجعت پسندی پیدا ہو جائے گی۔

آیات نمبر ۱ تا نمبر ۴ میں انسان اور اس کے خالق کی نسبت معین ہو گئی، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام اقوام کا رب ہے۔ (رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ) اس کی ربوبیت ان میں اسی طرح سے عمل کرتی ہے جس طرح سے باپ اور ماں کی محبت اور شفقت اولاد پر عمل کرتی ہے (الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ) وہی رب ان کے تمام جھگڑوں کا آخری فیصلہ کرنے والا اور ان کے حقوق دلانے والا ہے (مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ)۔ اب انسانیت کو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کس حاکم یا مالک کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

یہاں سورۂ فاتحہ کا نصف حصہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کی آیات میں جامع دعا سکھائی جاتی ہے جو انسانیت عامہ کی سب سے بڑی اور جامع ضرورت پوری کرنے کے لئے ہے۔

اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۝۵

ہمیں سیدھی راہ پر چلا۔ یہ دعا ہے۔ اِھۡدِ: یہ ھدایۃ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں رہنمائی کرنا، یعنی جہاں پہنچنا ہے اس منزل کی راہ بتانا۔

دعاء کی حقیقت:

انسان کے ظاہری اعضاء میں علیحدہ علیحدہ قوتیں پوشیدہ ہیں۔ ان قوتوں کو استعمال کرنا انسان کے لئے طبعی بات ہے۔ ان سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے، وہ اس کے لئے کوئی اجنبی چیز نہیں ہے، مثلاً جس شخص کی آنکھیں صحیح سالم موجود ہیں اس کے لئے روشنی سے بھی فائدہ اٹھانا کوئی تعجب کی چیز نہیں ہے یہ اس کی شخصیت کا جزء ہے۔ اسی طرح انسان اپنے ہر ایک عضو کی خاص قوت کو سوچ کر اپنے انا کا تصور بناتا ہے، چنانچہ جب انسان 'مَیں' (انا) کہتا ہے تو اس میں چلنے، پکڑنے، سننے، دیکھنے وغیرہ کی سب طاقتیں آجاتی ہیں۔ اسے کوئی تردد نہیں ہوتا کہ انسان سن نہیں سکتا یا پکڑ نہیں سکتا، کیونکہ وہ سب کیفیات اپنے اندر ہر وقت موجود پاتا ہے۔ جس شخص میں کوئی طاقت نہیں ہے وہ اپنی شخصیت کو اس طاقت کے فوائد سے وابستہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے اوروں میں اس طاقت کا ظہور و عمل اس کیلئے موجب حیرت ہوتا ہے۔ دماغی طور پر ترقی یافتہ انسان اپنے دماغی عمل سے ایسے نتائج نکالتے ہیں کہ دنیا انہیں دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ [1] لیکن ان کے لئے وہ اعمال، فطرت انسانی سے باہر کی چیز نہیں ہوتے وہ انہیں اپنے 'انا' میں مستور پاتے ہیں۔

انسان میں ایک قوت ہے جسے ارادہ کہتے ہیں، اس کے استعمال سے خاص نتائج پیدا ہوتے ہیں جو آنکھ یا کان کی قوت سے نہیں ہوسکتے۔ جب بدن کی طاقتیں ارادے سے متاثر ہو کر کام پر آمادہ ہوجاتی ہیں تو اسے "ہمت" کہتے ہیں، یہ ارادہ اور ہمت [2] جس آدمی میں زیادہ ہوتے ہیں، وہ بڑے بڑے کام کر سکتا ہے اور جس میں نہیں ہوتے وہ ان کاموں کو انسانیت سے اجنبی چیز سمجھے تو تعجب نہیں۔

---

[1] مثلاً مارکونی اطالوی نے بغیر تار کے پیغامات بھیجنے کا سلسلہ ایجاد کیا اور آئن سٹائن نے نظریہ اضافت پیش کیا جسے ابھی تک بہت کم حکماء پوری طرح سمجھ سکے ہیں۔ اس کے باوجود نظریہ اضافت سے مادے کے خواص کے متعلق جو نتائج نکلتے ہیں وہ تجربات سے صحیح نکلتے ہیں جیسے سورج گرہن کے وقت دورے سے آنے والی روشنی کی کرنوں کا سورج کے اثر سے انحراف وغیرہ (مرتب)

[2] امام ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں: "وَاعۡلَمۡ اَنَّ ھٰذِہِ الۡاَعۡمَالَ کُلَّھَا اَشۡبَاحٌ وَاَرۡوَاحُھَا ھِمَّۃُ الدَّاعِیۡ وَالصِّفَۃُ وَانۡجِذَابُہٗ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ" یعنی دعا مانگنے کے جتنے بھی اعمال ہیں وہ صرف صورتیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی روح دعا مانگنے والے کی ہمت ہے اور یہ صفت کہ وہ ملائکہ کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ (تفہیمات الٰہیہ ج ۱ ص ۱۰۰ ص ۴) (مرتب)

دعا کی پہلی اساس:

دعا سے مراد اس ارادے کا اظہار ہے جو ہم اپنے دل میں بناتے ہیں یعنی یہ کہ ہم عمل کریں گے ہم اس راہ میں اپنی تمام قوتیں صرف کر دیں گے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس راہ میں رکاوٹیں پیش آئیں گی۔ اس وقت ہم اپنے اللہ سے جو "رب"، "رحمٰن"، "رحیم"، اور "مالک و قادر" ہے درخواست کریں گے کہ وہ ان رکاوٹوں کو ہمارے راستے سے دور فرمانے میں ہماری مدد کرے، یہاں تک کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔

انسانی ارادہ کیسے کام کرتا ہے؟ اس کے عمل کا اصل منبع اور خزانہ حظیرۃ القدس ہے، اس سے ہر ایک انسان کا براہ راست تعلق ہے۔ جب انسانی ہمت حظیرۃ القدس تک پہنچ جاتی ہے تو وہ جو خیال بناتا ہے وہ خارج میں ظہور میں آ جاتا ہے۔ انسانی ہمت کے حظیرۃ القدس تک پہنچ جانے کو شرعی اصطلاح میں دعاء کہتے ہیں، اور اس کے نتیجے کے نکلنے کا نام "استجابت" ہے۔ اور حظیرۃ القدس کے ساتھ تعلق کو "تعلق باللہ" کہتے ہیں۔

دعا کے لئے دو ضرورتیں:

حظیرۃ القدس سے تعلق رکھنے اور اپنا راستہ زیادہ صاف کرنے کے لئے دو چیزیں کام دیتی ہیں۔

(۱) دماغ میں اس منظر کا ہر وقت اپنے سامنے رکھنا یعنی دماغ کا ہر وقت حظیرۃ القدس کی طرف متوجہ رہنا۔ اس توجہ سے ایسی قوت پیدا ہوتی ہے جیسے آسمان کی طرف دیکھنے سے سورج نظر آتا ہے۔ کسی انسان کی جس قدر توجہ زیادہ ہوتی ہے جو دماغ کی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے اسی قدر اس کی دعا جلد قبول ہوتی ہے یعنی اس کی توجہ کا نتیجہ جلد نکلتا ہے۔

(۲) انسان کے بدن کا حیوانی نجاستوں سے صاف ہونا اور لباس اور جگہ کا پاک ہونا اور فکر اور ارادے میں کسی چھوٹی چیز کا دیر تک نہ ٹھہرنا۔ مثلاً بھوک لگی، کھانے کی خواہش پیدا ہوئی جو میسر آیا کھالیا۔ اس کے بعد اپنی بھوک کا تصور بھی نہ رہا۔ یہ ایک چھوٹی سی بات تھی لیکن بڑی ضرورت تھی پوری ہو گئی اور اس کا تصوّر اور خیال جاتا رہا۔ لیکن چند بھوکے انسان ہیں ان کے لئے روٹی کا انتظام نہیں ہے، ان کے لئے ایک دن کا انتظام کر دینے سے ان کی بھوک کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اس کا انتظام سوچنے کے لئے کافی وقت اور توجہ کی ضرورت رہے گی۔ یہ ہے بڑا فکر جو جب تک پورا نہ ہو جائے سامنے رہنا چاہیۓ۔

جس شخص کا تعلق حظیرۃ القدس کے ساتھ قائم ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ اپنے ساتھ پاتا ہے۔ شرعی زبان میں اسے کہتے ہیں "اس کا اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے"۔ حظیرۃ القدس کا سمجھنا تو اہل علم کا کام ہے، عام زبان میں یہ کہہ

دینا کافی ہے کہ اٰمَنَ بِاللّٰہِ (وہ اللہ پر ایمان لے آیا)۔ جن لوگوں میں یہ طاقت نہیں ہے وہ اس طاقت کے نتائج کو انسانی فطرت سے اجنبی چیز سمجھتے ہیں۔ کبھی اسے کرامت کہہ دیتے ہیں کبھی معجزہ قرار دیتے ہیں۔ یہ فاقد البصیرۃ لوگوں کی اصطلاحیں ہیں۔ ورنہ تمام نتائج جو انسان کی ہمت سے پیدا ہوتے ہیں وہ سب انسان کی فطرت کا جز ہیں۔ اس سے باہر کی چیز نہیں ہیں۔ [1]

اجتماع مبعوث من اللہ ہوتا ہے:

اگر ایک آدمی قوت قلب کے ساتھ دعا مانگے اور اس کی کچھ قیمت (تاثیر کی مقدار) مقرر کرلی جائے اور دوسرا شخص اسی ہمت کا شریک دعا ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس کی تاثیر یا قیمت بڑھتی جائے گی۔ اس طرح بڑھتے بڑھتے جب ایک جماعت پیدا ہو جاتی ہے تو حظیرۃ القدس اُسے اپنا نمائندہ بنالیتا ہے۔ اب یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ان کے دل میں کوئی فکر آیا اور 'وہ کام ہوا' ان کی زبان سے دعا نکلی اور 'وہ قبول ہوئی'!

دینی اور لادینی جماعتیں:

دنیا میں جتنے بڑے بڑے کام ہوئے ہیں، وہ انسانوں کی جماعت کے مل کر کرنے ہی سے ہوئے ہیں۔ ان جماعتوں کی پہلی تقسیم یہ ہوگی:

(۱) حظیرۃ القدس کو ماننے والے، اور

(۲) حظیرۃ القدس سے غافل

---

[1] امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ معلوم رہے کہ اس فقیر کو آگاہ کیا گیا ہے کہ خوارق عادات اپنی ذات کی حد کے اندر امور عادیہ ہی ہیں بایں معنی کہ سنت اللہ یوں جاری ہے کہ جب نفس ناطقہ کسب یا جبلت سے اس درجے پر پہنچ جاتا ہے کہ غیب کی باتیں اس پر کھل جاتی ہیں اور اس کی دعا قبول ہونے لگتی ہے وغیرہ وغیرہ ایسے ہی سنت اللہ بھی جاری ہے کہ کوئی شخص جب تریاق کھالے اس پر سے زہر کا اثر جاتا رہتا ہے یا گوشت اور چربی خوب کھالے تو وہ موٹا ہو جاتا ہے لیکن جو چیز جس طرح ہوتی نظر آتی ہے اس کے خلاف واقع ہو جانا خارق عادت کہلاتا ہے۔

نیز یہ بھی اس فقیر کو اطلاع دی گئی ہے کہ خوارق کی ہر ایک نوع ایک کسب ہے جب کوئی شخص اس کسب سے تمسک کرتا ہے تو وہ خارق اس سے صادر ہونے لگتا ہے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ اہل غرض.... جب کسی وجہ سے اپنی ہمتوں کو حظیرۃ القدس تک پہنچادیتے ہیں جیسے نماز استقاء کے لئے لوگوں کے اجتماع عظیم سے یا عرفات کے میدان میں رحمت کے نزول کی طلب کے لئے دعا تو یہ نظام عالم میں اثر انداز ہوتا ہے۔

پس جب قوی عزم والا شخص جو جبلت یا کسب کے ذریعے سے (حظیرۃ القدس کی) قوت متفرقہ کے ساتھ مناسبت رکھتا ہو کسی کام کی طرف توجہ کرتا ہے تو یہ عزیمت حظیرۃ القدس تک پہنچتی ہے اور وہاں کسی نہ کسی شکل میں تاثیر کرتی ہے جو اس ہمت اور اسباب موجودہ کے بقدر عالم مادی میں اثر کرتی ہے۔ (ہمعات، ہمہ ۲) (مرتب)

ان میں سے پہلی جماعت کی دعوت کتب الٰہیہ دیتی ہیں اور دوسری جماعت میں وہ لوگ ہیں جنہیں ہم لادینی کہتے ہیں۔ اس آخر الذکر جماعت کے کام بھی ہوتے تو حظیرۃ القدس ہی کی طاقت سے ہیں، لیکن دماغی کمزوری کے باعث وہ اس مسئلے کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتے۔ اس لئے انہیں غافلین قرار دیا جاتا ہے۔ ہم نے لادینی لوگوں کی بہت سی جماعتوں کو بڑے بڑے کاموں میں کامیاب ہوتے دیکھا ہے۔ ان کے عمل کا تجزیہ کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ لوگ کچھ غفلت برتتے ہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو خدا پرست، مذہبوں کے پابند، حظیرۃ القدس میں فنا حاصل کرنے کے مدعی ظاہر کرتے ہیں ان کی ہمت ان لادینی لوگوں کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔ اس لئے خدا پرست لوگ ناکام ہو رہے ہیں اور ان کے مقابلے میں لادینی لوگوں کی ہمت چونکہ ایک صحیح کام پر متوجہ ہو گئی ہے اس لئے وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہمت کی تاثیر کے لئے جو شرطیں ہیں وہ دونوں کے لئے یکساں ہیں۔ ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ جب تک ایک انسان اپنے مقصد پر اپنی جان و مال دینا منظور نہ کرے ہمت کا وہ نصاب پورا نہیں ہوتا جو حظیرۃ القدس تک پہنچ کر وہاں کی قوتوں کو حرکت میں لا سکتا ہے۔

دعا کی دوسری اساس:

دعا کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہم یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے جو چیز مانگی جائے وہ ضرور ملتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ حکمت الٰہی کے مطابق جس چیز کی جہاں ضرورت ہوتی ہے، وہاں وہ ضرور پیدا کر دی جاتی ہے، لیکن اس امر کا اظہار کہ کس چیز کی ضرورت ہے؟ ہم اپنے فیصلے (دعاء) سے خود کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ہمارے فیصلے میں غلطی ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہماری طلب کردہ چیز پیدا نہیں کی جاتی۔ لیکن ہماری ذمہ شناسی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنے فیصلے سے وہ چیز اللہ تعالیٰ سے بار بار مانگیں اس میں یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر وہ چیز پیدا کرنا مناسب نہیں ہوتا تو آگے چل کر ہمیں بتا دیا جاتا ہے کہ اس چیز کا پیدا کرنا مناسب نہیں تھا۔ لیکن یہ اصول بہر کیف اپنی جگہ قائم رہے گا کہ ہم کوئی چیز اپنے ارادے اور فیصلے اظہار (دعاء) کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ سے مانگیں تو وہ ہماری طلب اور ضرورت کے مطابق عطا فرما دیتا ہے۔

سورۂ فاتحہ کی دعا کا مطلب:

اس آیت "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کے سلسلے میں دعا کی ان دونوں بنیادوں کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ ہم فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم سیدھے راستے پر چلیں گے۔ ٹیڑھے اور غلط راستے پر نہیں چلیں گے۔ یہ فیصلہ کر لینا انسان کا

بہت بڑا شرف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں غلطی ہوگی ہم اسے چھوڑتے جائیں گے۔ انسانیت کی ترقی کا یہی راستہ ہے، اس کے ساتھ ہی اس فیصلے کا اثر یہ بھی ہونا چاہئے کہ اپنی فطرت کو اپنے اوپر حاکم بنائیں۔ جو چیز اس کے خلاف ہمیں دکھائی دے اس کا انکار کردیں۔

فائدہ: جب ہمیں یقین ہوجاتا ہے کہ "رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ" ہماری تائید میں ہے، جو چیز ہم مانگتے ہیں وہ ضرور عطا فرمادیتا ہے، تو ہم کسی مخالف طاقت سے نہیں ڈرتے، مخالف طاقت کا ڈر دماغ سے نکال دیناہی کامیابی کا گُر ہے۔ جب ہم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کرلی تو ہمیں اطمینان ہوگیا کہ ہمارا مخالف کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا، اس سے ہماری طبیعت میں اول درجے کی ہمت اور شجاعت پیدا ہوتی رہے گی اور جو چیز مانگتے ہیں اس کا عطا کرنا بھی مناسب ہے تو وہ چیز پیدا بھی کردی جائے گی۔

دعاء کا فائدہ:

جب انسان کے دل میں یہ خطرہ موجود ہو کہ مطلوب حاصل کرنے میں موانع ہیں، تو قوت عملی نشاط کھو بیٹھتی ہے، اور قوت ارادہ پورے زور کے ساتھ عمل نہیں کرتی اور نتیجہ پوری طرح ظاہر نہیں ہوتا، لیکن جب انسان اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ کر اطمینان حاصل کرلیتے ہیں، تو ان کی قوت ارادہ تمام مظاہر عمل میں ابھرنے لگتی ہے۔

انبیاء کرام کی تعلیمات میں تحریف کرنے والوں اور فطرت انسانی کو مسخ کرنے والوں نے دعاء کے اس مفہوم کو بدل ڈالا ہے۔ فطرت سلیمہ ان کا انکار کرتی ہے ہم اپنی حکمت عملی میں دعا کو علت تامہ کا ایک جزو مانتے ہیں۔ ہمارے خیال میں کسی عمل کے بروئے کار آنے میں انسانی ارادے کو بھی دخل ہے۔

صراط مستقیم:

یہ دو طرح سے سمجھا جاسکتا ہے:

(۱) عقل و نظر کی روشنی میں، اور (۲) تاریخ و تجربے کی روشنی میں۔

(۱) **صراط مستقیم عقل کی روشنی میں**: عقل و نظر کی روشنی میں صراط مستقیم سے مراد ہے 'فطرت انسانی پر چلنا اور اس کے طبعی تقاضے پورے کرنا۔'

جب انسان کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے جو اس کے طبعی تقاضوں کے مطابق ہے، تو وہ ایسا محسوس کرتا ہے، گویا اسے ایک بھولی بسری چیز یاد دلائی گئی ہے، اس لئے جو علم انسان کو دیا جائے، جو اخلاق انسان کو سکھائے جائیں، اور سوسائٹی کا جو نظام اسے بتایا جائے وہ ایسا ہونا چاہئے کہ فطرت انسانی پکار اٹھے کہ یہ میری ہی چیز ہے جو مجھے بھولی ہوئی تھی۔

جب انسان کی فطرت سلیم ہو (یعنی بیمار نہ ہو) تو وہ اس تعلیم کی خوبیاں آسانی سے سمجھ سکتا ہے، اس کی صحت اور بیماری کا اندازہ عام لوگوں کی حالت سے مقابلہ کر کے لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک انسان ایک چیز سے نفرت کرتا ہے لیکن عام لوگوں کو دیکھیں تو وہ اس سے نفرت نہیں کرتے، تو یقیناً یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ شخص بیمار ہے۔ اس لئے قرآن حکیم کی اصطلاح میں صراط مستقیم کی ہر چیز کو "معروف" کہا گیا ہے۔ یعنی سب کی جانی پہنچانی ہوئی چیز۔ اس کے برخلاف جس چیز کو انسان کی فطرت سلیمہ قبول کرنے سے انکار کر دے، قرآن حکیم اسے "منکر" کہتا ہے یعنی "وہ چیز جسے انسانی فطرت نہیں پہچانتی کہ یہ اس کی ہے"۔

جو سوسائٹی انسانی فطرت سلیمہ پر قائم کی جائے گی، وہ لا محالہ معروف کا حکم دے گی اور منکر سے روکے گی۔ اس تعلیم کو صراط مستقیم کہتے ہیں۔

جب ہماری طبیعت مخلوقات میں سے کسی مخلوق کی پابند نہ رہے اور ہم اپنی پوری ہمت کے ساتھ فقط اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے لگیں اور یہ بھروسہ اس بھروسے سے زیادہ ہو جو آغاز طفولیت میں اولاد کو اپنے ماں باپ پر ہوتا ہے تو ہم اپنی فطرت کی تکمیل کے سوا کوئی بات نہیں سوچتے۔ اس وقت ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں اور دعا بھی فقط یہ کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (ہمیں سیدھی راہ، فطرت انسانی پر قائم رکھ!)۔ [1]

اس دعا کا اجتماعی پہلو:

سیدھے راستے پر چلنا انسانیت کا تقاضا ہے، لیکن "اِهْدِنِی" (مجھے چلا) کی جگہ "اِهْدِنَا" (ہمیں چلا) کہنا ظاہر کرتا ہے، کہ ایک فرد انسانی اپنے طبعی تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔ یہ تقاضے اعلیٰ درجے کے انسانوں کی سوسائٹی ہی میں پورے ہو سکتے ہیں۔

طلب ہدایت کی ضرورت:

ایک بچہ مدرسے میں داخل ہوتا ہے، اس کا طبّی معائنہ ہوتا ہے اور تندرست پایا جاتا ہے، اب یہ کہا جائے گا کہ 'یہ بچہ تعلیمِ مدرسہ کی تکمیل کرنے کے قابل ہے'۔ یہ حالت انسان کے طبعی تقاضوں کی سلامتی کی مانند ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ایک سو لڑکوں میں سے جو تندرستی کی حالت میں پہلی جماعت میں داخل ہوتے ہیں کتنے ہوتے ہیں جو

---

[1] امام ولی اللہ دہلویؒ انسان کی فطری ترقی کو چار منازل میں تقسیم کرتے ہیں: (۱) ارتفاق اول یعنی انسان کی زندگی جب وہ چھوٹے چھوٹے دیہات بسا کر رہتا تھا۔ (۲) ارتفاق دوم جب اس نے قصبے بسا کر رہنا شروع کیا۔ (۳) ارتفاق سوم جب اس نے حکومت کا نظام قائم کر لیا۔ (۴) ارتفاق چہارم جب مختلف قومیں مل کر ایک بین الاقوامی نظام قائم کر لیں۔ یہ ارتفاقات تہذیب نفس، تدبیر منزل، سیاست مدنیہ اور خلافت کبریٰ (انٹر نیشنل سٹیٹ) پر مشتمل ہیں۔ یہ انسان کی فطرت کے تقاضے ہیں اور ان کی صحیح شکل صراط مستقیم ہے۔ (مرتب)

کالج کی انتہائی جماعت تک پہنچ جاتے ہیں؟ جو وہاں تک نہیں پہنچ پاتے وہ کیوں پیچھے رہ جاتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بچوں کے ارد گرد جو قوتیں ان کے طبعی تقاضوں کے خلاف کام کر رہی ہیں، ان سے دب کر وہ پیچھے رہ جاتے ہیں، اور تکمیل کی انتہا کو نہیں پہنچ پاتے۔ کائنات میں انسان تنہا نہیں ہے بلکہ اس کے گرد بہت سی چیزیں اور قوتیں ہیں، مثلاً جمادات، نباتات، حیوانات، جن، فرشتے وغیرہ، انسان کو ان کے درمیان رہنا پڑتا ہے۔ اس کی طبیعت اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ [1]

عام مشاہدہ یہ ہے کہ انسان ہر وقت اپنے عقلی تقاضوں ہی سے اثر نہیں لیتا رہتا، کبھی اس پر اس کے حیوانی جذبات بھی غالب آ جاتے ہیں۔ جو غذا وہ کھاتا ہے اور جس سوسائٹی میں وہ رہتا اور کام کرتا ہے اس سے بھی اس کی طبیعت اثر لیتی ہے، اس لئے اسے تعلیم کی ضرورت ہے لیکن تعلیم میں جبر کا دخل نہیں ہوتا، وہ صرف یہ بتا سکتی ہے کہ انسانی فطرت کا تقاضا کیا ہے جس کے مطابق اسے کام کرنا چاہئے۔ دعا کے نتیجے کے طور پر یہ رہنمائی انسان کو ملتی رہتی ہے۔ قرآن حکیم پر عمل کرنے والوں کو یہ رہنمائی کسی نہ کسی شق میں ملتی رہے گی اور جو لوگ قرآنی انقلاب کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں گے ان کی رہنمائی ہوتی رہے گی۔

(٦) صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

(ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا)۔ ہم نے جو سیدھا راستہ مانگا ہے یہ اس کی مزید تشریح ہے۔

صراط مستقیم تاریخ کی روشنی میں:

پچھلی آیت میں صراط مستقیم کی جو طلب نظریے کی شکل میں تھی، وہ اس آیت میں تاریخ اور تجربے کی روشنی میں معین کر دی گئی ہے۔

مُنْعَمْ علیہ سوسائٹی:

انسان "مدنی الطبع" ہے وہ تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا، اس کے فطری قویٰ کی تکمیل سوسائٹی کے اندر رہ کر ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ہر شخص کے قویٰ کی تکمیل کے لئے نمونہ، سوسائٹی ہی میں مل سکتا ہے اور اس کا نظام، نظریاتی (Ideology) اجتماع میں شامل ہوئے بغیر جائے گیر نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی اس کی ارتقائی زندگی اجتماع کے بغیر

---

[1] امام ولی اللہ دہلویؒ حجۃ اللہ البالغہ جلد اول بَابٌ فِیْ اَسْبَابِ الْخُوَاطِرِ الْبَاعِثَةِ عَلَى الْاَعْمَالِ میں ان اسباب کا ذکر کرتے ہیں جو انسان کے اعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں ان میں طبعی ماحول، ملاءاعلیٰ اور شیاطین کے اثرات وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں طبعی ماحول سے مراد معاشی و معاشرتی ماحول ہے۔ (مرتب)

ترقی نہیں کر سکتی، چنانچہ اس آیت میں ایک سوسائٹی کی درخواست کی گئی ہے۔ جو "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" (انعام یافتہ لوگوں) کی ہے۔ جس اجتماع کے افراد کے فطری قویٰ کی ترقی کا سامان اللہ تعالیٰ بہم پہنچادے، وہ انعام یافتہ معاشرہ ہوتا ہے، اس کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے۔ جو شخص اس جماعت میں منسلک ہو جائے وہی "صراط مستقیم" پر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صراط مستقیم کی تعیین اور سوسائٹی کی طلب انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اگر وہ اس میں کوتاہی کرے تو وہ خود لائق ملامت ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھنی چاہئے کہ ایک آدمی کو بھوک یا پیاس لگتی ہے وہ خوراک یا پانی تلاش نہیں کرتا اور مر جاتا ہے تو اس کی ذمہ داری خود اس پر آتی ہے اور وہ خود ہی لائق ملامت ہے۔

خدا تعالیٰ کا بہترین انعام یہ ہے کہ کسی سوسائٹی میں اپنا حاکم ہو اور وہی اس سوسائٹی پر حکومت کرتا ہو، انسانی حریت انہی حالات میں قائم رہ سکتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں ایسی سوسائٹی دی جائے جو اعلیٰ درجے کے انعام یافتہ لوگوں پر مشتمل ہو۔ [1]

ترقی کن سوسائٹی کے چار اجزاء:

قرآن حکیم نے انعام یافتہ سوسائٹی کی تشریح اس آیت میں کی ہے "اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ (۴: ۶۹) (یعنی منعم علیہ، نبی، صدیق، شہید اور صالح ہوتے ہیں)۔ اس آیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں دو قسم کی قوتیں پائی جاتی ہیں۔

(۱) علمی اور (۲) عملی

اگر انسان کی فطرت سلیم ہو، تو علم اور عمل میں تفریق نہیں ہو سکتی، ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی انسان میں ایک قوت زیادہ ہو کسی میں دوسری، اسی وجہ سے انسان ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں، اور انہیں ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ اس کمی بیشی کے لحاظ سے انسان کی علمی اور عملی قوتوں کے دو درجے ہو سکتے ہیں۔

(۱) فاعلی اور (۲) انفعالی

(الف) **انبیاء:** جس انسان میں علمی اور عملی قوتیں فعالیت کے بہت بلند درجے پر ہوں وہ منبع علم [2] سے براہ راست

---

[1] امام ولی اللہ دہلویؒ انسانی معاشرے کی ترقی کی مختلف منزلوں کا ذکر کرتے ہوئے ارتفاق رابع (بین الاقوامی نظام یا خلافت کبریٰ) کا ذکر کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ جب خلیفہ وجود میں آجاتا ہے اور ملک کا نظام نہایت اعلیٰ پیمانے پر درست کرلیتا ہے جابر سے جابر حاکم اس کے آگے سر جھکا دیتے ہیں اور بادشاہ اس کے مطیع ہو جاتے ہیں تو تمت النعمۃ (نعمت الٰہی کامل) ہو جاتی ہے، گویا امام صاحبؒ کے نزدیک بین الاقوامی حکومت بلند ترین نعمت ہے جو کسی انسانی معاشرے کو مل سکتی ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ طبع منیریہ مصر ج ا ص ۴۷)

[2] امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے بعض فرشتے مقرب ہیں وہ خدا اور انسان کے درمیان پیام رسانی کا واسطہ (Medium) ہیں۔ ان کے اجتماعات بھی ہوتے ہیں جنہیں ملاء اعلیٰ کہتے ہیں۔ انسانی اجتماع کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایات پہلے اس ملاء اعلیٰ میں نازل ہوتی ہیں۔ ان کا اجتماع روح اعظم کے پاس ہوتا ہے تو اس کے انوار آپس میں مل جاتے ہیں اسے حظیرۃ القدس کہتے ہیں۔ اس اجتماع میں بنی آدم کے لئے پروگرام طے ہوتے ہیں جن کا علم اس سارے زمانے کے سب سے پاک دل انسان کو بذریعہ الہام دیا جاتا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۶۱۵ ملخصاً) (مرتب)

علم حاصل کر سکتا ہے اسے نبی کہتے ہیں۔ یہ صدیقین، شہداء اور صالحین پیدا کرنے والے اساتذہ ہیں۔

(ب) **صدیقین**: جس شخص میں علمی قوت انفعالی لحاظ سے بلند درجے کی ہو وہ منبع علم سے براہ راست تو علم حاصل نہیں کر سکتا، لیکن اگر اس میں عملی قوت بہت بلند درجے کی ہو تو اسے صدیق کہتے ہیں۔

(ج) **شہداء**: جو لوگ قوت عملی میں بلند درجہ کے مالک ہوتے ہیں، لیکن صدیق سے کم درجے کے ہوتے ہیں اور علم میں بھی اس سے کم درجے کے ہوتے ہیں لیکن وہ جس چیز کو حق سمجھتے ہیں، اسے کامیابی سے چلا نہ سکیں تو اس کوشش میں جان تک لڑا دیتے ہیں۔ وہ شہید کہلاتے ہیں۔

(د) **صالحین**: جو لوگ علم و عمل میں نچلے درجے کے ہوتے ہیں، لیکن صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ مل کر کام کر سکتے ہیں اور عمر بھر امر حق میں کوشش کرتے رہتے ہیں وہ صالح کہلاتے ہیں۔

ایک ترقی کن سوسائٹی میں ان چار طاقتوں کے علاوہ اور کیا چاہئے؟ ایسی سوسائٹی میں نبی بطور معلم کام کرتا ہے، وہ صدیق اور شہید پیدا کرتا ہے اور صالحین کو جمع کرتا ہے۔

یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ ہم صراط مستقیم پر چلیں گے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ایسی سوسائٹی دے جس میں مذکورہ بالا چاروں قسم کے انعام یافتہ لوگ ہوں۔ اس سے ہماری یہی مراد ہے کہ ہم خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی پیدا کردہ سوسائٹی کے نمونے پر ایسی سوسائٹی پیدا کرنی چاہتے ہیں جس میں نبی اپنی زندہ تعلیم کے ساتھ تو موجود ہی ہے اس میں صدیق ہوں جن کی فطرت کے مطابق قرآن حکیم کی تعلیم ہے وہ اس تعلیم کو پوری طرح سے سمجھتے ہیں اور اس پر اپنی جان و مال قربان کر سکتے ہیں۔ جس میں شہید ہوں جو قرآن حکیم کے پروگرام کو چھوڑنا برداشت نہ کریں خواہ انہیں جان دینی پڑے، جس میں صالحین ہوں جن کی ہر ایک کام کرنے والے کو ضرورت ہوتی ہے۔ [1]

---

[1] خیر القرون کی تشریح بقول امام ولی اللہؒ تاریخی طور پر اس قسم کی مکمل سوسائٹی وہ ہے جو حضرت نبی اکرم ﷺ نے پیدا کی اس سوسائٹی کی نسبت خود آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ "خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم" (بہترین دور میرا دور ہے اس کے بعد ان لوگوں کا دور جو اس دور کے بعد آئیں گے پھر ان لوگوں کا جو ان کے بعد آئیں گے)۔

امام ولی اللہ دہلویؒ اس کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ قرن اول زمان آنحضرت ﷺ بود از ہجرت تا وفات، و قرن ثانی زمان شیخین و قرن ثالث زمان ذی النورین، بعد ازاں اختلافہا پدید آمد و فتنہا آظاہر گردید (ازالۃ الخفاء عن خلافت الخلفاء مقصد اول ص ۱۲۱)

یعنی خیر القرون کا پہلا درجہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا زمانہ ہے، جو ہجرت سے وفات تک کا ہے۔ اس کا دوسرا درجہ سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا فاروق اعظم کا دور ہے اور تیسرا درجہ سیدنا عثمان غنیؓ کی شہادت تک کا زمانہ ہے۔ اس کے بعد اختلافات پیدا ہوگئے اور فتنوں نے سر اٹھایا۔

یہ خیر القرون (اپنے تینوں درجوں میں) رہتی دنیا تک ہر ایک ترقی کن معاشرے کے لئے نمونہ رہے گا۔ اس مکمل سوسائٹی کو قرآن حکیم "وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ" (۹: ۱۰۰) (سب سے پہلے ایمان لانے والے مہاجرین اور انصار میں سے ہیں) کی اصطلاح سے ظاہر کرتا ہے اور "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ" (۴۸: ۲۹) (محمد رسول اللہ اور آپ کے ساتھی) میں معہ (اس کے ساتھ والے) میں اس جماعت مہاجرین و انصار کی طرف اشارہ ہے۔ مہاجرین اور انصار کے دور کے بعد جو لوگ ان کی پیروی کرکے ہر زمانے میں ایسے ہی معاشرے پیدا کرتے رہیں گے۔

(۷) غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ :

(الف) اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ

"مَغْضُوْبِ عَلَيْهِم" کون ہیں؟ : انسانی زندگی تقسیم نہیں ہوسکتی، یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص میں صرف علم ہی علم ہو اور دوسرے میں فقط عمل ہی عمل۔ عام طور پر یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ علم اور عمل ایک نہ ایک حد تک ہر ایک انسان میں پائے جاتے ہیں۔ جس شخص نے اپنا علم تو بڑھالیا اور عملی قوتوں کو ترقی نہ دی، وہ "مَغْضُوْب عَلَيْهِمْ" ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حق کو پہچانتے ہیں اور یہ بھی انہیں معلوم ہے کہ صراط مستقیم کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں، اس کے باوجود وہ عمل کے لئے نہیں اٹھتے۔ جبکہ ہم ان سے پناہ مانگتے ہیں! وہ لفاظی کے ذریعے سے لمبے لمبے خواب سنائیں گے اور طرح طرح کے سنہرے باغ دکھائیں گے۔ سادہ مزاج انسان ان کی صحت اور غلطی کا فیصلہ نہیں کر سکیں گے، ہم ایسے لوگوں کا ساتھ نہیں دینا چاہتے۔

رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں "مَغْضُوْب عَلَيْهِمْ" کی مثال یہودیوں سے دی جاتی تھی۔ ❶ جب اسلامی نظام موجود ہو تو جو شخص جہاد سے گھبرائیں، وہ اس شق میں آتے ہیں اور جب اسلامی نظام ٹوٹ گیا ہو اور جہاد کے

وہ "وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ" (۹ : ۱۰۰) میں داخل ہوں گے اور وہ بھی معہ میں شامل ہوں گے۔ ان کے لئے خیر القرون نمونہ ہوگا اور وہ خود اپنے زمانے کے لئے نمونہ ہوں گے اور "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کا مصداق قرار پائیں گے۔

(ذیلی حاشیہ)

ا ۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا کہنا ہے کہ پہلا درجہ حضرت نبی اکرم ﷺ اور سیدنا ابو بکرؓ کا زمانہ ہے اور دوسرا درجہ سیدنا فاروق اعظمؓ کا دور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سیدنا صدیق اکبرؓ نے کوئی نیا کام نہیں کیا چنانچہ : (۱) خلافت کے نظم و نسق میں خلل آیا یعنی زکوۃ دینے والوں نے زکوۃ مرکزی حکومت کو ادا کرنے سے انکار کر دیا تو انہیں مرکزی حکومت کے تحت لے آئے۔ (۲) جو مہم حضرت نبی اکرم ﷺ حضرت اسامہ بن زیدؓ کی قیادت میں بھیجنے کا اہتمام فرما رہے تھے اور آنحضرت ﷺ کی وفات کی وجہ سے رک گئی تھی وہ روانہ کردی۔ (۳) نبوت کے مدعیوں کا قلع قمع کیا۔ (۴) تقسیم معاش کا وہی اصول رکھا جو نبی اکرم ﷺ نے قائم فرمایا تھا یعنی ہر ایک خاندان کو بقدر ضرورت دینا اور مناصب اور اسلامی خدمات کی وجہ سے کمی بیشی نہ کرنا۔ (۵) جو وظیفہ اپنی ضروریات کے لئے بیت المال سے لیا تھا وہ وفات کے وقت واپس کر دیا یہ اول درجے کا دور ہے۔

سیدنا فاروق اعظم نے آگے چل کر اسلامی خدمات اور قرابت نبی اکرم ﷺ کی بنا پر وظائف میں کمی بیشی کر دی۔ لیکن اول تو انہوں نے اس تقسیم میں بھی عدل سے کام لیا اور جسے حساب کی رو سے جتنا حق پہنچتا تھا اتنا دے دیا۔ اس میں کسی وجہ سے رو رعایت نہیں کی دوسرے بعد میں اس کمی بیشی کے اصول کو جاری کرنے پر افسوس کیا اور فرمایا کہ اگر میں اگلے سال انہی ایام میں زندہ رہ گیا تو یہ نیا قاعدہ بدل کر سیدنا ابو بکرؓ کا اصول عمل میں لاؤں گا لیکن وہ اپنی شہادت کی وجہ سے یہ اصول نہ بدل سکے۔ یہ دوسرے درجے کا بہترین دور ہے۔ سیدنا عثمان غنیؓ کا دور تیسرے درجے کا بہترین دور ہے۔ کیونکہ انہوں نے بیت المال سے اپنا حق پورا لینا شروع کر دیا تھا اگرچہ وہ اسے بھی اپنے حاجت مند عزیز و اقارب میں تقسیم کر دیتے تھے۔

اول درجے کے لوگ اسلامی حکومت پیدا کریں گے تو ان کے لئے نبی اکرم ﷺ اور سیدنا ابو بکرؓ کا دور نمونہ ہوگا لیکن عام لوگ کثرت سے شامل ہوں گے تو سیدنا فاروق اعظمؓ کا دور نمونہ ہوگا یا سیدنا عثمان غنیؓ کا دور قابل قبول ہوگا اس سے کم درجے کی کوئی حکومت نبوی طریق کی اسلامی حکومت نہیں کہلا سکتی۔ (مرتب)

❶ امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں دہلی کے اکثر علماء اس کی مثال تھے۔ شیخ الہند محمود حسنؒ کے زمانے میں جو لوگ جہاد کے نام سے گھبراتے تھے وہ اسی ذیل میں آتے ہیں آج جو لوگ انقلاب کے نام سے گھبراتے ہیں وہ بھی اس مد میں داخل سمجھنے چاہئیں۔ یہ لوگ نہ مسلمانوں کی سوسائٹی کے معزز ممبر ہیں نہ امام ولی اللہ کی سوسائٹی کے آدمی ہیں۔ نہ مولانا شیخ الہند کے آدمی ہیں اور نہ ہم انہیں اپنے ساتھ رکھنا پسند کرتے ہیں۔ (عبید اللہ سندھیؒ)

لئے جس نظام کی ضرورت ہے وہ نہ رہے تو جو لوگ انقلاب کے ذریعے اس نظام کو دوبارہ پیدا کرنے کی ہمت نہ بنائیں وہ بھی اسی شق میں داخل ہیں۔ جو علماء کہلا کر جہاد اور انقلاب سے بچنے کی کوشش کریں، وہ سب سے زیادہ اس شق میں شامل ہیں۔ ایسے نام نہاد علماء کو ختم کر دینا چاہیے۔ جب تک کسی انقلابی جماعت میں یہ بات نہیں آتی وہ قرآن کی حکومت پیدا نہیں کر سکتی۔

(ب) الضَّآلِّيْنَ

ضالین کون ہیں: یہ وہ لوگ ہیں، جن میں صحیح علم نہیں ہے یا بہت ہی کم ہے لیکن عملی قوت بہت زیادہ ہے۔ ان کی مثال رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں نصاریٰ[1] تھے۔ وہ مسیحؑ کو ابن اللہ مانتے ہیں، لیکن رومی سلطنت جیسی وسیع سلطنت بھی چلاتے ہیں۔ انہیں مسیحؑ کو ابن اللہ ماننے کا نقصان یہ پہنچا کہ مسیحؑ کے درجے کے جو خدام انسانیت پیدا ہوئے ان کا انکار کر بیٹھتے ہیں۔ اس طرح وہ انسانیت میں گمراہی پھیلاتے ہیں۔ حالانکہ حضرت مسیحؑ اس سے زیادہ کیا تھے کہ اللہ تعالیٰ کے منعم علیہ بندے تھے۔ اور اس لئے انعمت علیہم سے باہر نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے سوا اور لوگوں پر بھی انعام کئے ہیں، ان کا انکار کیوں؟ یہ ان لوگوں کی گمراہی ہے۔

ہمارے زمانے میں جو علماء، قرآنی سیاست کو چھوڑ کر سیاست میں کسی قوم کی تقلید کرتے ہیں وہ " مَغْضُوْب عَلَيْهِمْ " کی زد میں آتے ہیں اور جو انگریزی دان دوسری قوم کی سیاست کی تقلید کرتے ہیں وہ الضَّآلِّيْنَ کی شق میں شامل ہیں۔ جو بات تم خود نہیں سمجھتے اور اس کی ذمہ داری نہیں لے سکتے اس کی ذمہ داری مت لو سمجھ بوجھ کر جو سیاسی کام کر سکتے ہو وہ کرو ورنہ خاموش بیٹھو۔

ایسے ہی لوگ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں کوئی شخص قرآن حکیم کو نہیں سمجھ سکتا، وہ بھی ضالین میں سے ہے۔ امام ولی اللہ دہلویؒ، نے ہمارے زمانے کے لوگوں کے لئے قرآن سمجھنے کی تمام لفظی و معنوی دقتیں دور کر دی ہیں، اب اس کتاب عظیم کا سمجھنا نہایت آسان ہوگیا ہے۔ اب بھی یہ کہنا کہ قرآن حکیم سمجھ میں نہیں آسکتا پرلے درجے کی گمراہی (ضلالت) ہے۔ (نعوذ باللہ من ذلك!)

اٰمین:

اس دعا کے معنی یہ ہیں کہ خدایا! کرۂ زمین پر صالح سوسائٹی موجود ہے تو ہمیں اس کے ساتھ ملنے کی توفیق فرما، اگر نہیں ہے تو یہ توفیق عطا فرما کہ ہم ایسی سوسائٹی خود پیدا کریں۔

---

[1] امام ولی اللہ دہلویؒ کے زمانے کے بعض مشائخ طریقت اور مولانا شیخ الہند کے زمانے میں جہاد کے مخالف یا اس کی اہمیت نہ سمجھنے والے ضالین میں داخل ہیں۔ ہمارے جو ساتھی انقلاب کو نہیں جانتے یا اسے جاننے کی کوشش نہیں کرتے وہ ہمارے ساتھ نہیں ہیں ہم جس انقلاب کے داعی ہیں اس کے اصول وہی ہیں جو امام ولی اللہ دہلویؒ نے خیر القرون سے لے کر مدون کئے ہیں۔ (عبیداللہ سندھیؒ)

اس میں شک نہیں کہ یہ بات بہت مشکل ہے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اس ارادے کے بغیر صراط مستقیم کی تعمیر ہو بھی نہیں سکتی۔

قرآن کا مقصد :

قرآن حکیم کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایسی سوسائٹی پیدا کی جائے، جو صراط مستقیم پر چلتی ہو۔ اس لئے وہ ہر شخص سے سورۂ فاتحہ کا اقرار کرانا چاہتا ہے۔ تاکہ ہر وقت اس کے ذہن میں رہے اور وہ اس امر کو ہر دم ملحوظ خاطر رکھے کہ اس کی زندگی کا مقصد اس قسم کی سوسائٹی پیدا کرنا ہے اور کچھ نہیں۔

بینُ الاقوامی دعا :

قرآن حکیم عالمگیر اجتماعی تحریک کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اس دعا میں جو عالمگیر اجتماعی تحریک کا عنوان ہے، قومی مقتضیات کا تعین نہیں کیا گیا۔

عقلی نظریات کے اعتبار سے لوگ مختلف طبقات کے ہوتے ہیں، گو سب کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ اس لئے صراط مستقیم ایک قوم کے ذہن میں کسی شکل میں آتی ہے اور دوسری قوم کے ذہن میں کسی اور صورت میں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو جو دعا الہام فرمائی ہے وہ ان تمام تشخصات سے پاک ہے جو قومی اثرات سے پیدا ہوتے ہیں۔ جو شخص اپنی انسانی فطرت کے مطابق خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرلیتا ہے، اس کے لئے صراط مستقیم کی دعا کیا مشکل ہے ؟

ایسے ہی صراط مستقیم کے عملی پہلو کی تعیین اور "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کے ذریعے سے اس کی تفصیل میں کسی قوم کے بڑے آدمی کا نام نہیں لیا گیا۔ جو شخص سلامتی فطرت کے ساتھ اپنے رب پر اعتماد کرلیتا ہے، کیا وہ ان لوگوں کے اجتماع سے الگ رہ سکتا ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا؟

ہم نے انبیاء کرام کی کتابوں میں سے کسی نبی کی کتاب میں ایسی دعا نہیں دیکھی جو شخصی، قومی، جغرافیائی اور نسلی اثرات سے پاک ہو، صرف سورۂ فاتحہ کی اجتماعی انقلابی دعا ہی ایسی دعا ہے جو ان تمام اثرات سے پاک ہے، اس پر تمام اقوام جمع ہو کر آمین ! کہہ سکتی ہیں۔

صلٰوۃ کیا ہے؟ :

صلٰوۃ (نماز)، اصل میں اس بات کا نام ہے کہ انسان اپنے پورے ارادے اور اپنی ہمت کے ساتھ ملاء اعلیٰ کے

ساتھ اتصال پیدا کرے اور وہاں سے آنے والی تجلی الٰہی سے قلبی رابطہ قائم کرے۔ اس اتصال اور رابطے کا فائدہ یہ ہو گا کہ وہ جو چیز طلب کرے گا حسب حالات اسے دی جائے گی اور سب سے بڑی اور سب سے اہم چیز جو انسان اللہ تعالیٰ سے طلب کر سکتا ہے، وہ اپنی فطرت سلیمہ کے تقاضے کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق ہے۔ انسان کی فطرت سلیمہ کے تقاضے ہی صراط مستقیم ہے۔

اس لئے ملاء اعلیٰ میں تجلی الٰہی کے ساتھ رابطہ قائم کر کے وہ دعا کرتا ہے کہ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ - صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" یہ اصل چیز ہے، جو انسان کو ترقی کی راہ پر لگاتی ہے۔ اس لئے نماز، گویا دعا مانگنے یا سورہ فاتحہ پڑھنے کا نام ہے، طہارت اور قبلہ کی طرف منہ کرنا اس صلوٰۃ کے مبادی ہیں اور رکوع و سجود اس کے مکملات ہیں۔ اس کی روح یہ ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ وہ اپنے رب کے حضور میں کھڑا ہے اور اپنی احتیاج پیش کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ صراط مستقیم کی ہدایت عطا فرمائے۔

اس کے ساتھ جو آیات یا سورت پڑھی جاتی ہے وہ گویا اس دعا کا جواب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ ہدایت یہی قرآن ہے، تم جتنا آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھو تو ہدایت یاب رہو گے۔ اس کے بعد رکوع و سجود اس دعا کے قبول ہونے کے لئے شکریے کے اظہار کے طور پر ہیں۔ [1]

اب جو مسلمان صلوٰۃ ادا کرے وہ جماعت کے ساتھ ادا کرے کیونکہ اھدنا کا یہی تقاضا ہے۔ [2]

---

[1] نماز کا یہ مفہوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے معین فرمایا ہے۔ (عبید اللہ سندھی)

[2] حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب نماز میں بندہ سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "قَسَمْتُ الصَّلٰوۃَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ" (یہ نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان آدھی آدھی تقسیم ہو گئی ہے)

جب بندہ کہتا ہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ" (میرے بندے نے میری ستائش و تعریف کی) پھر جب بندہ کہتا ہے: "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ - مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ"

تو اللہ ارشاد فرماتا ہے ہے: "مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ" (میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی)

اور جب بندہ عرض کرتا ہے: "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ"

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "هٰذَا بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ" (یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے)

اور جب بندہ کہتا ہے: "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ"

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "هٰذَا لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَأَلَ" (یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے مانگا ہے)

(مرتب)